اُردو شاعری میں حُب الوطنی

(۱۸۵۷ء ـــــــــ ۱۹۴۷ء)

مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی

۱۹۹۴ء

مقالہ نگار

محمد شجاعت علی

نگران

ڈاکٹر رحمت یوسف زئی

شعبۂ اُردو سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد

ترتیب ابواب

دیباچہ ۱ - ۱۷

پہلا باب ۱۸ - ۴۱

حب وطنی کی تعریف، قومیت اور وطنیت، حب وطنی کا مغربی تصور

حب الوطنی مغربی مفکرین کی نظر میں

دوسرا باب ۴۲ - ۹۲

شاعری میں حب وطنی کی روایت، بیسویں صدی تک

(۱) دکنی شاعری میں حب وطنی کے اثرات

(۲) دہلی کی شاعری میں حب وطنی کے اثرات

(۳) لکھنؤ کی شاعری میں حب وطنی کے اثرات

تیسرا باب ۹۳ - ۱۵۲

۱۵۰۰ء سے ۱۹۰۰ء تک ملک کی مختلف تحریکات

اور ان کے اثرات

چوتھا باب ۱۵۳ - ۲۰۰

بیسویں صدی کے آغاز کا سیاسی پس منظر اور حب الوطنی کا نیا شعور

پانچواں باب ۲۰۱ - ۳۷۹

ہندوستان کی جدوجہد آزادی اور حب الوطنی

چھٹا باب ۳۸۰ - ۴۰۶

حب الوطنی کے مختلف مظاہر۔ منتخب نظموں سے اقتباس

حرفِ آخر ۴۰۷ - ۴۱۶

کتابیات ۴۱۷ - ۴۲۶

حرفِ آغاز

بعض الفاظ مجرد ہوتے ہیں اور اس وجہ
سے ان کے معنیٰ کا تعین بہت دشوار ہوتا ہے۔ ایسا ہی ایک لفظ
"محبت" ہے۔ عربی کے اس لفظ کا مادہ حُب ہے اور اس کے
معنی ہیں چاہنا۔ یہ چاہت خواہش کے معنی میں نہیں ہے بلکہ وابستگی
کے معنی میں ہے۔ یہیں سے یہ بحث بھی شروع ہو جاتی ہے کہ کسی
بھی شئے سے محبت کا تقاضا کیا ہے؟ اگر کوئی شخصیت ہو تو شاید
محبت کے تقاضوں کا تعین بھی ہو سکے لیکن اگر اتفاق سے وہ بھی
مجرد تصور ہو تو پھر بے حد مشکل پیدا ہو گی۔ وطن بھی مجرد تصور
ہے اور اس طرح حب الوطنی محض تصورات کا نام رہ جاتا ہے۔
لیکن اس مشکل کا ایک ہی حل ہے۔ جسے محبت کہا
جاتا ہے اس کا تعین اس کے مظاہر سے ہو گا۔ مثلاً چھوٹے بچوں
سے بچے کو دیکھ کر پیار آتا ہے۔ اس پیار کا اظہار اسے گود میں لے
کر اسے بوسے دے کر اور اس کے ساتھ کھیل کر کیا جاتا ہے۔ یہ
سارے اعمال دراصل اس جذبے کے مظہر ہیں جسے محبت کہا جاتا
ہے۔ یا اپنی رہائش گاہ سے محبت ہے تو اس کا اظہار شاید یوں

ہو رہا ہے۔ لان میں پانی دیا جا رہا ہے۔ ٹیرس کی صفائی کی جا رہی ہے، جھاڑ فانوس لگائے جا رہے ہیں۔ فرنیچر سے کمروں اور ڈرائنگ روم کو سجایا سنوارا جا رہا ہے اسی طرح ہر شئے کے ساتھ محبت کا تصور بدلتا رہتا ہے۔

یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ یہ جو مظاہر ہیں وہ اگر مختلف ہو سکتے ہیں تو پھر کیا ضروری ہے کہ اسے محبت ہی سمجھا جائے؟ اکثر تو یہ بھی ہوا ہے کہ ابتدائے محبت میں یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ محبوب ہماری ہی زبان بولے، ہمارا ہی معاشرہ اختیار کرے۔ ظاہر ہے کہ یہ تصور درست نہیں ہے۔ محبت کے معنی ہیں جس سے محبت کی جائے اس کی خوشی، اس کی سربلندی، اور اس کی بہتری کے بارے میں سوچا جائے۔

وطن اور وطنیت کے سلسلے میں آئندہ صفحات میں تفصیل سے لکھا گیا ہے یہاں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ وطن کا تصور بہت سارے اجزاء سے مل کر تیار ہوتا ہے۔ پہلی شرط یہ ہے کہ (۱) ایک خطہ ارض ہو جسے ہم واحدہ کہہ سکیں (۲) اس واحدے کا ایک انتظامیہ ہو (۳) اس واحدے کے لوگ ارنسٹ رینان کے

اصلوں میں اپنے منبر یہ دلہ سلوہ کی تاریخ مالسلل رائے ہوں۔

(ب) ہر نسل نے اپنے سے پہلی نسل کی وراثت قبول کی ہو۔

وطن کے سلسلے کا یہ تصور سیاسی دانشوروں اور سماجیات کے ماہرین کی ملی جلی رائے کا نچوڑ ہے۔ اس میں سب سے اہم پہلو ہے وہ باطنی احساس، جو کسی فرد یا افراد کو کسی ایک خطہ ارض سے وابستہ رکھتا ہے اور یہ وابستگی جیسے ہی ختم ہوتی ہے ویسے ہی اس شخص کا اس ملک یا وطن سے جذباتی تعلق ختم ہو جاتا ہے۔ اس کی ہزار ہا مثالیں ہیں۔ اشارتاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ سارے لوگ جو ترک وطن کرتے ہیں یا ایک جگہ سے دوسری جگہ جا کر بس جاتے ہیں دراصل ان کی ایک علاقے سے وابستگی ختم ہو جاتی ہے۔ کسی علاقے سے وابستگی کا ختم ہونا دو بنیادوں پر منحصر ہے۔

(i) یا تو اس علاقے کے لوگ اسے نکال رہے ہوں (ii) یا پھر اس نے مفادات کی خاطر اپنے بہتر مفاد کے لیے کسی دوسری جگہ کا انتخاب کیا ہو۔ اس مختصر سی وضاحت کے ساتھ اب حب الوطنی کی اصطلاح زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔ یعنی حب الوطنی سے مراد ہے کسی ایک علاقے سے وابستگی کی بنا پر اس کے ارتقاء کی خواہش

اور اس ارتقا کی راہ میں رکاوٹوں کو دور کرنے کی جدوجہد

راقم الحروف نے ان ہی کی بنیاد پر اپنے خیال کی قبا حُب اور وطن

کے تصور کو پہنانے کی کوشش کی ہے۔

اس مقالے کی ابتدا میں ہندوستان کا حدود اربع

متعین کیا گیا ہے۔ وطن سے مراد ہندوستان ہے جس کے شمال

میں ہمالیہ ہے اور جس کے دونوں طرف بحر ہند اور بحر عرب۔

اس علاقے کے دریا، پہاڑ، چشمے، جھرنے، باغ، چمن زار کا

جہاں بھی کسی شاعر نے تذکرہ کیا وہ اسی وطن کی محبت میں کیا

ہے۔ چناں چہ ایسی ساری نظموں پر تفصیلی بحث کی گئی ہے جس

میں ہندوستان کا فطرت کا عطا کردہ پس منظر موجود ہے۔ محبت

کا ایک انداز یہ بھی ہوتا ہے کہ جس سے محبت کی جاتی ہے اس کے

ہر رُخ کا تذکرہ توصیف و تحسین کے ساتھ کیا جاتا ہے حُب الوطنی کا

ایک رخ یہ بھی ہے۔ اس موقع پر ضمناً یہ عرض کرنے کو جی چاہتا ہے

کہ "رودکی" نے کچھ اس انداز سے بخارا کی لہروں کا ذکر کیا تھا کہ

بادشاہ فوراً گھوڑے پر بیٹھ کر وطن کے لیے روانہ ہو گیا تھا۔

یہ چیزیں اردو کے شاعر کے یہاں بھی ملتی ہیں۔ کیوں کہ شاعر اپنے

وطن کی ان تمام اسناد سے مرتب کیا ہے جو عام حالات میں نہیں اہم سمجھی جاتی ہیں۔

اس سلسلے میں ہندوستان کے ساتھ یہ خصوصیت رہی کہ تقریباً ڈیڑھ سو برس اس پر سات سمندر پار سے آئے ہوئے لوگوں کا اقتدار رہا۔ اس اقتدار کا نقطہ آغاز جہانگیر کے عہد میں حاصل کردہ وہ مراعات تھیں جس کی وجہ سے سورت، آگرہ، اجمیر، احمد آباد مسولی پٹم اور ملکتہ میں انگریزوں کی تجارتی کوٹھیاں قائم ہو چکی تھیں۔ پھر ۱۶۱۵ء میں جب پرتگالیوں اور انگریزوں کے درمیان سمندری لڑائی ہوئی تو اس میں انگریزوں کو غلبہ حاصل ہوا اور یہی ہندوستان پر انگریزوں کے اقتدار کا نقطہ آغاز تھا۔ اور پھر انھوں نے اپنی سازشوں کے پیر پھیلائے۔ جہانگیر کے دربار تک رسائی حاصل کی۔ جنوب کے مشرقی ساحل پر قلعہ تعمیر کیا جو بعد میں مدراس کے نام سے موسوم ہوا۔ سمندری راستوں پر ان کی بالادستی نے مغل سلطنت کو پریشان کر رکھا تھا یہاں تک کہ ۱۶۹۸ء میں شاہی جہاز کو انگریزوں نے لوٹ لیا تھا یہ دور اورنگ زیب کا تھا۔ اورنگ زیب نے کمپنی کی درخواست پر ان کو

معاملہ بھی عطا کی تھی لیکن اورنگ زیب کے انتقال کے بعد
انگریزوں نے اس ملک کی سیاسی زندگی میں دخل دینا شروع کیا
اور پھر ۱۷۶۴ء میں جنگ بکسر میں فتح یاب ہونے کے بعد انگریزوں
نے شاہ عالم سے معاہدہ کر کے دیوانی فرمان حاصل کیا جس کے
تحت بنگال، بہار اور اڑیسہ کے مالی معاملات یہاں تک کہ دیوانی
مقدمات کے فیصلے انگریزوں کے اختیار میں آگئے۔ رفتہ رفتہ
انگریزوں کا اقتدار یہاں تک بڑھا کہ دلّی دربار کے فیصلے بھی
انگریزوں کی مرضی کے مطابق ہونے لگے۔ ظاہر ہے کہ یہ بات
یہاں کے عوام کے لیے ناپسندیدہ تھی اس لیے اندر ہی اندر انگریزوں
کے خلاف نفرت کی ایک لہر پیدا ہوئی جس کا انجام پہلی جنگ آزادی
کے طوفان کی صورت میں نمودار ہوا۔ اس دور سے لے کر آزادی
کامل تک جد و جہد کی تاریخ، آزادی کی تمنا اور تڑپ، آزادی
کے حصول میں پیدا کی جانے والی رکاوٹوں کو دور کرنے کی خواہش
یہ سب حب الوطنی کے مظاہر تھے اسی لیے انھیں نظر انداز نہیں
کیا جا سکتا تھا۔ چناں چہ چاہے سودیشی تحریک ہو یا جلیان والا
باغ پر لکھی گئی نظمیں ہوں یا ہندو مسلم اتحاد کے سب حب الوطنی

کے مظاہر تو ہیں۔

ادب میں تسلسل ناگزیر حیثیت رکھتا ہے۔ کوئی نظریہ یا خیال اچانک وجود میں نہیں آجاتا۔ حب الوطنی کی جو روایت ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک بنی اور جس روایت کے مختلف مظاہر سامنے آئے اس کی داغ بیل بہت پہلے پڑ چکی تھی دراصل وہ تمام لوگ جو اردو کو بدیسی زبان کہتے ہیں ان سب کو یہ جاننا چاہیئے کہ اردو کا کردار یادگار حیثیت رکھتا ہے اس لیئے کہ اس "ویدیشی زبان" کی سرشت اور خمیر میں حب الوطنی موجود تھی۔ فارسی میں مقامی الفاظ کی آمیزش سے ریختہ تیار کرنے والے امیر خسرو سے لے کر دکن کے محمد قلی قطب شاہ اور شمالی ہند کے شعرائے متاخرین تک سب کے یہاں اگر بت پرستی ہے تو یہ بت وطن کی محبت کا بت ہے اس لیئے پس منظر کے طور پر اردو کی قدیم تاریخ کو نظر انداز کرنا ممکن نہ تھا۔

حب الوطنی اور جارحانہ وطن پرستی دو متضاد تصورات ہیں۔ کم از کم راقم نے ان دونوں میں ہمیشہ تضاد محسوس کیا۔ اپنے گھر سے محبت کرنے والا دوسرے کا گھر اگر

کے مظاہر تھے۔

ادب میں تسلسل ناگزیر حیثیت رکھتا ہے کوئی نقوش یا خیال اچانک وجود میں نہیں آجاتا۔ حب الوطنی کی جو روایت ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک بنی اور جس روایت کے مختلف مظاہر سامنے آئے اس کی داغ بیل بہت پہلے پڑ چکی تھی دراصل وہ تمام لوگ جو اردو کو بدیسی زبان کہتے ہیں ان سب کو یہ جاننا چاہیئے کہ اردو کا کردار یادگار حیثیت رکھتا ہے اس لیئے کہ اس "دیدیشی زبان" کی سرشت اور خمیر میں حب الوطنی موجود تھی۔ فارسی میں مقامی الفاظ کی آمیزش سے ریختہ تیار کرنے والے امیر خسرو سے لے کر دکن کے محمد قلی قطب شاہ اور شمالی ہند کے شعرائے متاخرین تک سب کے یہاں اگر بت پرستی ہے تو یہ بت وطن کی محبت کا بت ہے اس لیئے پس منظر کے طور پر اردو کی قدیم تاریخ کو نظر انداز کرنا ممکن نہ تھا۔

حب الوطنی اور جارحانہ وطن پرستی دو متضاد تصورات ہیں۔ کم از کم راقم نے ان دونوں میں ہمیشہ تضاد محسوس کیا۔ اپنے گھر سے محبت کرنے والا دوسرے کا گھر اگر

کے مظاہر تو ہیں۔

ادب میں تسلسل ناگزیر حیثیت رکھتا ہے۔ کوئی نقد یا خیال اچانک وجود میں نہیں آجاتا۔ حب الوطنی کی جو روایت ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک بنی اور جس روایت کے مختلف مظاہر سامنے آئے اس کی داغ بیل بہت پہلے پڑ چکی تھی دراصل وہ تمام لوگ جو اردو کو بدیسی زبان کہتے ہیں ان سب کو یہ جاننا چاہیئے کہ اردو کا کردار یادگار حیثیت رکھتا ہے اس لیئے کہ اس "ویدیشی زبان" کی سرشت اور خمیر میں حب الوطنی موجود تھی۔ فارسی میں مقامی الفاظ کی آمیزش سے ریختہ تیار کرنے والے امیر خسرو سے لے کر دکن کے محمد قلی قطب شاہ اور شمالی ہند کے شعرائے متاخرین تک سب کے یہاں اگر بت پرستی ہے تو یہ بت وطن کی محبت کا بت ہے اس لیئے پس منظر کے طور پر اردو کی قدیم تاریخ کو نظر انداز کرنا ممکن نہ تھا۔

حب الوطنی اور جارحانہ وطن پرستی دو متضاد تصورات ہیں۔ کم از کم راقم نے ان دونوں میں ہمیشہ تضاد محسوس کیا۔ اپنے گھر سے محبت کرنے والا دوسرے کا گھر اگر

اجاڑ دے تو پھر وہ اپنے گھر سے محبت نہیں رکھتا۔ ذاتی طور پر میرا یہی ایمان ہے خواہ ہندوستان کی تاریخ ہو یا عالمی تاریخ ہر جگہ ان بادشاہوں کا نذکرہ ملتا ہے جو دوسرے ملکوں میں داخل ہوئے تو بستیاں اجاڑ کر رکھ دیں اور یہ عمل ہمیشہ اور ہر دور میں مطعون سمجھا گیا۔ کیوں کہ جس کے پاس بستی کے تصور سے محبت نہ ہوگی وہ اپنی اور غیر کی بستی میں کوئی فرق محسوس نہیں کر سکتا اس کا کام تو اجاڑنا ہی ہے جسے جارحانہ وطن پرستی کہا جاتا ہے۔ دراصل وہ بین الاقوامی غنڈہ گردی تھی (یا ہے) انسان کی وحشیانہ اور بربریت سے بھرپور جبلت جس کی بنیاد صرف نفرت پر ہوتی ہے، محبت پر نہیں ہوتی، دوسروں کو غلام بنا کر تسکین حاصل کرتی ہے اس لیئے وطنیت کے جس تصور کی اقبال نے مخالفت کی تھی اس تصور کی مخالفت ہر باشعور انسان کو کرنی چاہیئے۔ لیکن وطنیت کا وہ تصور دراصل فسطائیت ہی کی ایک شکل ہے۔

قومی یکجہتی اور وطن پرستی ایسے موضوعات ہیں جن پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ لیکن حب الوطنی کے

ان جذبات کو تلاش کرے اور ان کو صحیح انداز سے پیش کرنے کی اب تک جو کوششیں کی گئی تھیں وہ بہر حال ناکافی تھیں اسی لیئے اس بات کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ ایک مبسوط مقالہ اس موضوع پر قلم بند کیا جائے۔

مقالے کو چھ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔

پہلے باب میں حب الوطنی، قومیت اور وطنیت کی تعریف کی گئی ہے۔ دوسرے باب میں اردو شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے انیسویں صدی تک کی گئی شاعری میں حب الوطنی کے جذبات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ تیسرے باب میں پہلی جنگ آزادی یعنی ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۹۰۰ء تک ہندوستان میں رونما ہونے والی مختلف اہم تحریکات کا جائزہ لیا گیا ہے اور اردو شاعری پر ان کے اثرات کی نشاندہی کرتے ہوئے حب الوطنی کے جذبات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ چوتھے باب میں بیسویں صدی کے آغاز کا سیاسی پس منظر اور عالمی تصورات کے زیر اثر ہندوستان میں پیدا ہونے والا حب الوطنی کا نیا شعور زیر بحث آیا ہے۔ پانچویں باب میں ہندوستان کی جد وجہد آزادی

کے سب سے اہم دور یعنی بیسویں صدی کے آغاز سے لے کر ہندوستان کی آزادی تک اردو شاعری نے جدوجہد آزادی کے ضمن میں جو اہم کارنامے انجام دیئے اور جس طرح اپنا کردار ادا کیا اس کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ چھٹے باب میں حب الوطنی کے مختلف مظاہر جیسے مختلف شہروں، موسم تہوار، میلے وغیرہ پر لکھی گئی نظموں اور مذہبی رسماؤں کو خراج عقیدت پیش کرنے والی نظموں سے چند اقتباسات پیش کیے گئے ہیں۔

خدائے بزرگ و برتر کا کرم اور میرا وجود جن کی وجہ سے ہے ان کی دعائیں شامل حال نہ ہوتیں تو میرا یہ کام کبھی پورا نہ ہوتا۔ میرے والد محترم جناب محمد رحمت علی صاحب اور میری "ماں" نے میرے لیئے وہ سب کچھ کیا جو ماں باپ کے فرائض میں شامل ہوتا ہے۔

میرا یہ مقالہ استاد محترم ڈاکٹر رحمت یوسف زئی صاحب ریڈر شعبہ اردو سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد کی زیر نگرانی پایہ تکمیل کو پہونچا۔ ڈاکٹر صاحب نے پروفیسر

سید مجاور حسین رضوی صاحب کے وظیفۂ حسن خدمات پر
سبکدوش ہونے اور الٰہ آباد منتقل ہونے کے بعد سے اس
مقالے کی تکمیل کے سلسلے میں ہر ہر قدم پر نہ صرف میری رہنمائی
کی بلکہ اس موضوع سے متعلق ان تمام پہلوؤں کے سلسلے میں جو
میری کم علمی کے باعث تشنہ رہ گئے تھے اپنے مفید مشوروں
کے ذریعہ انھیں پورا کرنے کا حوصلہ بخشا۔ جس کے لیے
میں ڈاکٹر رحمت یوسف زئی صاحب کا دل کی گہرائیوں سے
شکریہ ادا کرتا ہوں۔

صدر شعبہ اردو پروفیسر سیدہ جعفر صاحبہ
پروفیسر ثمینہ شوکت صاحبہ، ریڈر ڈاکٹر انوار الدین صاحب
کے علاوہ شعبہ ہذا سے وابستہ ان تمام حضرات کا بھی ممنون
ہوں جنھوں نے اس مقالے کی تکمیل کے سلسلے میں میری مدد کی
یا نیک تمناؤں کا اظہار کیا۔

استاد محترم پروفیسر سید مجاور حسین رضوی
صاحب کا اگر شکریہ ادا نہ کروں تو یہ ایک ناقابل معافی
امر ہوگا۔ استاد محترم نے شعبہ ہذا سے سبکدوشی کے بعد

ابتدائی ایام حیدرآباد تک اور رحال ہی میں حیدرآباد میں اپنی آمد کے موقع پر اس لی نوک و پلک درست کرنے میں میری جس طرح سے رہنمائی کی اس کے لیے میں ان کا شکریہ تو ادا کرنا چاہتا ہوں لیکن الفاظ قلم کا ساتھ چھوڑ رہے ہیں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اس مقالے میں جہاں کہیں بھی اہم باتوں کا ذکر ہے وہ ان ہی کی خصوصی دلچسپی، رہنمائی اور شفقت کا نتیجہ ہے۔

اس مقالے کی تکمیل کے دوران جناب منظور الامین صاحب ریٹائرڈ اڈیشنل ڈائرکٹر جنرل دوردرشن، ممتاز ناول نگار محترمہ رفیعہ منظور الامین، اسٹیشن ڈائرکٹر آل انڈیا ریڈیو کتہ گوڑم جناب کبیر احمد صاحب، پروگرام اگزیکٹیو آل انڈیا ریڈیو جناب دانش اقبال، پروگرام اگزیکٹیو آکاش وانی حیدرآباد جناب اسلم فرشوری، جناب امتیاز علی تاج پروگرام اگزیکٹیو دوردرشن کیندر حیدرآباد، جناب عبدالرحیم صاحب (رحیم بھائی آرٹسٹ) اور ان تمام کرم فرماؤں کا بھی ممنون ہوں جنھوں نے میری حوصلہ افزائی کی یا اپنی نیک خواہشات کا اظہار کیا۔

میں اپنے دوستوں جناب عزیز احمد نمائندہ اردو بلٹز حیدرآباد، جناب سید قطب الدین احمد حسینی (لیٹق بھائی) مینجنگ پارٹنر بیکن اڈورٹائزنگ اینڈ مارکٹنگ، جناب حلیم اختر صدیقی مینجنگ پارٹنر دکن پن اسٹور، جناب عمر فاروق نمائندہ پائنیر جناب سید تمیم سکریٹری اسلامک اکیڈمی آف سائنس، جناب فرخ شہریار نمائندہ اوسی ایشیا نیوز سروس، جناب شوکت حسین اسٹاف فوٹو گرافر روزنامہ سیاست، جناب فہیم احمد خوشنویس روزنامہ سیاست اور جناب رضی اللہ حسینی کا بے حد ممنون ہوں کیوں کہ ان لوگوں نے مجھ سے نیک تمنائیں وابستہ کی تھیں۔

آخر میں اپنے اس دوست کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جس نے موضوع کے انتخاب سے مقالہ کی تزئین کاری تک ہر ہر قدم پر میرا ساتھ دیا چوں کہ میں نے اپنا شکریہ ادا نہیں کیا ہے اس لیئے اپنے اس دوست کا بھی شکریہ ادا نہیں کر رہا ہوں جس کی وجہ سے میرا یہ مقالہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔

ایک طالب علم کے ذہن میں بہت ساری باتیں

ہر دور میں معاملہ رہی ہیں لیکن معاہیم واضح نہیں ہوتے ان کی وجہ سے ذہنی خلفشار رہتا ہے۔ مجھے فخر ہے کہ محترم پدم شری سید علی جواد زیدی نے میری بڑی رہنمائی کی۔ جو سوالات میرے ذہن میں اٹھے تھے میں نے ان کی خدمت میں اسے روانہ کیا تو انھوں نے جواب دیا حرف آغاز کے ان تمہیدی کلمات کا اختتام ان ہی کے خط پر کیا جا رہا ہے۔

"حب وطن کے معنی تو وہی ہیں جو انگریزی میں Patriotism کے ہیں یعنی اپنے ملک کی خوش حالی، آزادی اور حقوق کے لیئے سرگرم رہنا اور اس کی حفاظت و حصول کے لیئے جد و جہد کرنا۔ اس میں ممنی سوالات بہت سے اٹھتے ہیں کہ خود ہمارا تصور حب وطن کیا ہے؟ کس حد تک اور کن حدود کے اندر ہمارے جذبہ وطن پرستی کو چلنا چاہیئے؟ ایک منزل ایسی آتی جب وطنیت بین الاقوامیت اور انسان دوستی سے ٹکراتی نظر آتی ہے ان حالتوں میں کیا کرنا چاہیئے؟ یہ تفصیل طلب مباحث ہیں۔ زمانہ حال میں بہت سی بحثیں چلی ہیں۔ اقبال بعد میں وطنیت کے جذبے کے مخالف نظر آنے لگے تھے۔ لیکن رسول اکرم کی حدیث واضح ہے "حُبُّ الوطن مِنَ الایمان" کوئی چیز جو داخل

ایمان ہو وہ دین فطرت میں آفاقیت اور انسان دوستی کے منافی
نہیں ہو سکتی۔ اگر حب وطن کو ان ہی حدود میں رکھا جائے کہ وطن کی
فلاح و بہبود و ترقی و آزادی اور حقوق انسانی کی حفاظت کے
حصول کی سرگرمی سے کوشش کی جائے اور اس حفاظت کو شعار و اصل
کردار بنایا جائے تو کوئی قباحت نہیں ہوتی لیکن اگر حدود وطن میں
توسیع کے لیے یا ملک گیری کی ہوس میں یا تجارتی اور اقتصادی
مقاصد کے حصول کے لیے جارحانہ رویہ اختیار کیا جائے اور دوسروں
کے وطن کے حدود میں مداخلت کی جائے یا ان کی تجارتی ناکہ بندی کی
جائے یا ان پر سیاسی طور سے ناجائز دباؤ ڈال کر یا نسل کشی وغیرہ
کے غلط احساسات کے ماتحت ان کی آزادی اور ان کے حقوق پر
حملہ کیا جائے تو یہ سامراجی اور نو آبادیاتی رویہ بین الاقوامیت
کے صالح اصول اور انسان دوستی کے مبارک مقاصد سے ٹکراتا ہے اور
یہ جارحیت مزید جارحیت کا جگہ دیتی ہے اور جنگ و جدل کا
ذریعہ بن کر امن عالم کے لیے خطرہ بن جاتی ہے۔ اس کے سد باب کے
لیے ادارہ اقوام متحدہ وغیرہ کا قیام عمل میں آیا ہے لیکن ابھی تک عالمی
اقدار کی حفاظت کا انتظام نہیں ہو پایا ہے۔ پھر بھی دنیا وحدت

انسانی کی طرف بڑھ رہی ہے اور جب یہ جذبہ اچھی طرح دلوں میں گھر کر لے گا تو صالح وطن پرستی ایک جذبۂ پائدار بن جائے گی۔

حب وطن کے مظاہرے بھی کئی طرح سے ہوئے ہیں۔ جب تک انگریزی سامراج ہندوستان میں تھا تو اس سے لڑنا ہی حب وطن تھا۔ اس میں مختلف خیالات کے لوگوں نے حصہ لیا اور اس عمومی مقصد کے حصول کے لیئے اپنے اپنے طریقے پر کام کیا۔ اس میں فرقہ پرست بھی تھے اپنے فرقے کے مفاد کی خاطر ملکی مفاد کو نقصان بھی پہنچا سکتے تھے اور بعض عناصر نے پہنچایا۔ ان میں سوشلسٹ اور کمیونسٹ بھی تھے لیکن ان کا جذبۂ حب وطن طبقاتی مفاد کو بھی اپنی نگاہوں میں رکھے ہوئے تھا۔ کچھ ایسے عناصر بھی تھے اور ہر دور میں رہے ہیں جنھوں نے ذاتی مفادات کے لیئے غداری کرنے سے بھی گریز نہیں کیا۔ یہ سچے وطن دوست نہیں تھے کیوں کہ سچا وطن دوست وہی ہے جو ہر طبقے، ہر قبیلے، ہر نسل، ہر فرقے، ہر خطے، ہر انسانی گروہ اور جغرافیائی گروہ کی ترقی و آزادی و حقوق کے لیئے کوشاں ہو۔ اگر وہ چھوٹے چھوٹے خانوں میں سوچتا رہے گا تو ملک میں عدم استحکام، عدم سکون اور عدم تحفظ پیدا ہوگا۔

آپ نے یہ سوال بھی اٹھایا ہے کہ مذاہم کی تکمیل کے لیے کیا اقدامات حب الوطنی پر محمول کیے جائیں گے؟ اگر عمل کا محرک "خالص" حب وطن ہے تو اسے حب وطن کہا جائے گا مثلاً انگریز دشمنی اگر اس لیے ہو کہ انگریزی سامراج ملک کی آزادی کی دشمن اور حقوق انسانی کی دشمن ہے تو ٹھیک ہے، لیکن اس کا رخ انگریزی حکومت کی طرف ہونا چاہیے۔ عام انگریز جس کو نہ حکومت سے مطلب ہے نہ حکمرانوں سے اس کو نشانہ بنانا حب وطن نہیں ہے کیوں کہ اس سے ملک و قوم کی شخصیت کا چہرہ مسخ ہوتا ہے اور پھر فسطائی تصورات جنم لیتے ہیں[1]۔"

---

[1] علی جواد زیدی صاحب محمود آباد ضلع اعظم گڑھ کے رہنے والے ہیں انھوں نے لکھنو یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی اپنے عہد شباب میں انھوں نے آزادی وطن کی تمام تحریکات میں حصہ لیا قید و بند کے مصائب برداشت کیے لیکن جیل کی مشقت میں مشق سخن جاری رہی وہ شاعر بھی ہیں اور محقق بھی۔ اس وقت جب کہ وہ (۷۸) برس کے ہو چکے ہیں ان کا علمی سفر آج بھی جاری ہے۔ آپ کا تحریر کردہ خط راقم کے پاس محفوظ ہے۔

پہلا باب

حُبُّ الوطنی کی تعریف، قومیت اور وطنیت

حُبُّ الوطنی کا مذہبی تصوّر

حب الوطنی مغربی مفکرین کی نظر میں

قرآن حکیم میں ارشاد ہوا " وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ۭ (سورہ اعراف ع ۱)
"مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى ۝" (ع ۱۱ پ ۱۶ سورہ طٰہٰ) "ہم نے تم کو پہلی بار زمین میں اور تمہارے لیئے زندگی و معیشت کے اسباب و ذرائع زمین میں پیدا کیئے۔ اسی زمین میں سے تم کو پیدا کیا ہے اسی میں تم کو دوبارہ لوٹائیں گے اور اسی سے دوسری بار تم کو نکالیں گے۔"

عرب کا مقولہ تھا " ارض الرجل ضرعہ و دارہ وطنہ " یعنی انسان کا ملک اس کی مرضعہ (دودھ پلانے والی ماں) ہے اس کا گھر ہے اور مرنے کے بعد اس کا گہوارا ہے۔ سرور کائنات محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کا آبائی وطن مکہ معظمہ تھا لیکن ہجرت کے بعد جب مدینہ طیبہ کو وطن قرار دیا تو مدینہ کے لیئے آپ کی دعا ہوا کرتی تھی کہ " اے اللہ ہمارے پھلوں میں برکت عطا فرما، ہمارے مدینے میں برکت

عطا فرما' ہمارے پیمانوں اور وزنوں میں برکت عطا فرما۔ خداوندا حضرت ابراہیم علیہ السلام آپ کے بندے آپ کے خلیل اور آپ کے نبی تھے اور میں بھی آپ کا بندہ اور آپ کا نبی ہوں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کے لیئے آپ سے دعا کی خداوندا میں مدینے کے لیئے دعا کرتا ہوں مکہ سے دوچند برکتیں مدینہ طیبہ کو عطا فرما۔ خداوندا ہمارے اندر مدینے کی محبت اتنی ہی پیدا کر دے جتنی تو نے مکہ کی محبت دی ہے"[1] اس دعائے مبارک سے وطن قدیم اور وطن جدید کی محبت اور پھر اس کی اقتصادی ترقی، آب و ہوا کی اصلاح کے جذبات صاف واضح ہو رہے ہیں۔

سرور کائنات محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا آبائی وطن مکہ معظمہ تھا لیکن کلمہ کی سربلندی اور دین کی فلاح و بہبود کے لیئے جب ترک وطن کرنا پڑا تو آپ نے مکہ سے اپنے قلبی انس کا اظہار ہمیشہ کیا۔

"اے مکہ تو خدا کا مقدس شہر ہے تو مجھے کس

---

[1] "ترمذی شریف" ج ۱ ص ۱۸۲

مدینہ محبوب ہے! اے کاش تیرے باشندے
مجھے لکھنے پر مجبور نہ کرتے تو میں تجھ کو نہ چھوڑتا۔ [1]

اس سے آپ کے حب وطن کے جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔

اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس نے بنی نوع انسان کو اعلیٰ ترین انسانی قدروں سے آگاہ کیا۔ جب حضورؐ پر دین مکمل ہوا تو اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ جتنے ممکنہ مسائل تھے ان تمام کا حل بھی پیش کر دیا گیا۔ اسلام چوں کہ ایک آفاقی ضابطۂ حیات ہے اس لیئے اس کا کوئی بھی جزو انسان دوستی کے منافی نہیں ہو سکتا۔ اسلام میں عقائد کو یقیناً اہمیت حاصل ہے لیکن وطن کو کبھی نظر انداز نہیں کیا گیا۔ اور نہ ہی مذہب نے حب الوطنی کو نیچا دکھانے کی کوشش کی۔

اسلامی فقہ کے ماہرین واقف ہیں کہ عقائد وطن پرستی پر کبھی حاوی نہ ہو سکے اور اسلام نے حب الوطنی کے جذبات کو کبھی ٹھیس نہیں پہنچائی اور نہ ہی کلچر یا ثقافت کو متاثر کیا۔

---

[1] "جمع الفوائد" ج ۱ ص ۱۹۵

جس کا ثبوت ہمیں آج بھی مل جاتا ہے کہ دنیا کے مختلف خطوں میں مسلمان آباد ہیں ان کی قومیت جدا، ان کے لباس مختلف، ان کا دین سہن علیحدہ، ان کے رسوم و رواج منفرد ہیں عقائد کے اعتبار سے یہ سب مسلمان ہیں لیکن زندگی کے باقی تمام معاملات میں اپنی انفرادیت کو متاثر نہیں ہونے دیتے۔ کیوں کہ مذہب نے اس بات سے کبھی منع نہیں کیا کہ وہ اپنا پسندیدہ طرز رہائش زبان اور انداز اختیار کریں۔

حب الوطنی کا دار و مدار قومیت اور

وطن سے متعلق تصورات پر ہے اس لیے حب الوطنی کی تعریف کرنے سے پہلے قومیت، وطنیت اور ان کے مابین رشتے کا سرسری جائزہ لینا ضروری ہے۔

پروفیسر مجاور حسین رضوی لکھتے ہیں

"قوم کا وجود کوئی الہامی شئے نہیں ہے

بلکہ تاریخ کا ایک سماجی عمل ہے"۔ [1]

---

[1] "اردو شاعری میں قومی یکجہتی کے عناصر" ڈاکٹر سید مجاور حسین رضوی ص ۱۳

جان اسٹوارٹ مل کے مطابق

"قومیت کا جوہر باہمی ہمدردی اور اپنی
حکومت کے تحت متحد رہنے کی خواہش ہے
جو ماضی کی تاریخ و سیاست، جذبہ افتخار
و مذلت، دکھ اور سکھ کے مشترکہ جذبات
کی بنیاد پر پیدا ہوتی ہے۔" [1]

ارنسٹ رینان کا خیال ہے

"قومیت کا تعین نسل، مذہب، زبان،
مملکت، تہذیب یا اقتصادی مفادات
کی بنیاد پر نہیں ہوتا بلکہ عظیم افراد صحیح
عظمت اور مشترکہ تجربات ایک قومیت
کی تشکیل میں معاون ہوتے ہیں اور
اس سے بھی زیادہ وہ مشترکہ دکھ
ہیں جو فتوحات سے زیادہ ایک قوم
کو وجود میں لاتے ہیں ایک قوم ماضی کی

---

[1] J.S. MILL: Consideration of Representative Govt P 287

قربانیوں کے شعور اور مستقبل میں مزید
قربانیاں دینے کی رضامندی کے احساس سے
جنم لیتی ہے۔" [1]

چناں چہ جب حکومتیں ٹوٹتی ہیں یا جڑتی ہیں تو پھر قومیت اسی کے حساب سے بدل جاتی ہے۔ متحدہ ہندوستان کے رہنے والے سارے لوگ ہندوستانی قوم تھے۔ اب ہندوستانی قوم کے معنی بنگلہ دیش یا پاکستان کے رہنے والے نہیں ہیں۔ اسی طرح بعض علاقے امریکی حکومت میں شامل ہو گئے تو وہ بھی امریکی ہو گئے جیسے ہوائی کے جزائر۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ قومیت کے تعاون کے لیے علاقائی وحدت اور سیاسی اعتبار سے بھی ایک اکائی ہونا ضروری ہے۔

قدیم زمانے میں قومیت کا تصور نسل، زبان اور مذہبی یکسانیت پر مبنی تھا لیکن قومیت کے جدید تصور کی رو سے مذہب اور قومیت کے خانے بالکل جدا جدا ہیں۔ ساری دنیا میں قومیت کا مطلب بدل چکا ہے۔ ہم سب کی قومیت ہندوستانی ہے خواہ مذہب کچھ بھی ہو۔

---

[1] Dr. Rajendra Prasad: India Divided P.8

قومیت کے سلسلے میں یہ بحث بھی بہت سرا ٹھاتا رہا ہے کہ کیا
مذہب قومیت کی تشکیل کرتا ہے؟ چنانچہ بیسویں صدی کی دوسری
اور تیسری دہائی میں "معرکہ دین و وطن" گرم رہا۔ اقبال نے
اس سلسلے میں بہت سارے شعر لکھے اور مولانا حسین احمد مدنی پر طنز
بھی کیا اس زمانے میں یہ بحث ہوتی تھی کہ آپ پہلے ہندوستانی ہیں یا
مسلمان؟ اس سلسلے میں مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے ایک خطبۂ
صدارت میں اس اہم مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہوئے مختصر ترین
لفظوں میں یہ کہا کہ "میں ہندوستانی مسلمان دونوں میں کوئی تضاد
نہیں اس لیے کسی طرح کے تقدم یا تاخر کا سوال نہیں"۔ اور یہ بات
درست بھی ہے قومیت کا تعلق علاقے سے ہوتا ہے۔ انڈونیشیا
کا رہنے والا بھی مسلمان ہے اور بلوچستان کا رہنے والا بھی مسلمان
ہے کیا دونوں کی قومیت ایک ہو سکتی ہے ——— ؟ پروفیسر
مجاور حسین رضوی صاحب لکھتے ہیں

"قوم کے لیے اپنے معروضی وجود کی خاطر علاقہ
اور حکومت اور اپنے داخلی وجود کے لیے
تہذیبی رشتہ اور مشترکہ تاریخی احساس رکھنا

کا اساسی جذبات ہے جب قومی ہم آہنگی کے
شعور کو جذب کرنا، چین میں منگولیا اور
سنکیانگ کے علاقوں میں رہنے والی قومیتوں
کا ایک دوسرے سے وابستہ ہو جانا سب اس
بات کا ثبوت ہیں کہ ایسی ہی صورتیں مختلف
قومیتوں کے مشترکہ احساس کو مضبوط بناتی
ہیں ان کے درمیانی خلاء کو پر کرتی ہیں اور ان
کے درمیان ایسے رشتے پیدا کرتی ہیں جو انھیں
متحد رکھنے میں معاون ہوں۔" [1]

برطانوی دور حکومت میں بھی جب کہ کتنے ہی رہنماؤں کے ذہنوں پر دو قومی نظریے کا بھوت سوار تھا بعض قوم پرست ہندو اور مسلمانوں کی شعوری کوشش "ایک ہندوستانی قوم" کی تشکیل کی طرف کسی نہ کسی حد تک ضرور رہی۔ دو قومی نظریے کے خلاف گاندھی جی نے قوم سے کہا تھا

"مذہب قومیت کی کسوٹی نہیں یہ خدا اور

---

[1] "اردو شاعری میں قومی یکجہتی کے عناصر" ڈاکٹر مجاور حسین رضوی ص ۱۶

آدمی کے درمیان ایک ذاتی معاملہ ہے

قومیت کے اعتبار سے ہم اول و آخر ہندوستانی

ہیں چاہے ہمارا مذہب کچھ بھی ہو"۔ [1]

اور مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا

"میرے الفاظ یہ تھے کہ ہندوستان کے

سات کروڑ مسلمان بائیس کروڑ ہندوؤں

کے ساتھ مل کر ایسے ہو جائیں کہ دونوں

مل کر ہندوستان کی ایک قوم اور نیشن

بن جائیں۔ اب میں مسلمان بھائیوں کو

سنانا چاہتا ہوں کہ خدا کی آواز کے بعد

سب سے بڑی آواز جو ہو سکتی ہے وہ

محمدؐ کی تھی۔ اس وجود مقدس نے جو

عہد نامہ لکھا اس کے الفاظ ہیں "انہٗ

امتہٗ واحدہ" ہم ان تمام قبیلوں سے

جو مدینے کے اطراف میں بستے ہیں صلح کرتے

---

[1] "شاعر" قومی یکجہتی نمبر

ہیں اور ہم سب مل کر ایک قوم بننا

چاہتے ہیں۔" [1]

قومی وحدت کے بہت بڑے مبلغ سرسید کے یہ جملے "اے ہندو مسلمانو! کیا تم ہندوستان کے سوا اور ملک کے رہنے والے ہو کیا اس زمین پر تم دونوں نہیں بستے۔ کیا اس زمین میں تم دفن نہیں ہوتے، کیا اس زمین کے گھاٹ پر جلائے نہیں جاتے۔ اسی پر مرتے ہو اسی پر جیتے ہو۔ یاد رکھو ہندو اور مسلمان ایک مذہبی لفظ ہے ورنہ ہندو، مسلمان اور عیسائی جو اس ملک میں رہتے ہیں اس اعتبار سے سب ایک قوم ہیں۔" [2]

اس طرح قومیت کا احساس بالکل داخلی امر ہے۔

حب الوطنی تک پہنچنے کے لیے دوسری اہم کڑی وطن ہے۔ وطن ہی انسانی سماج یا معاشرے کو ایک خاص رشتہ اتحاد سے مربوط کرتا ہے۔

وطن کا تصور انسان کے اپنے اندرون سے متعلق ہے

---

[1] "خطبات آزاد" مرتب مالک رام ص ۱۵

[2] "شاعر" قومی یکجہتی نمبر

ادی طور پر یہ بالکل داخلی شئے ہے جو نفسیاتی اور جذباتی طور پر قائم ہوتا ہے۔ وطن کے تصور میں علاقائی حد بندی بھی ہے اور وہاں کے مخصوص رسوم و رواج اور ثقافتی عوامل بھی وطن کی تشکیل میں معاون ہوتے ہیں۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ وطن دراصل جذبہ ہے جو تاریخی ورثہ کی طرح منتقل نہیں ہوتا بلکہ ہر شخص کے ساتھ اس کا اپنا تصور اور اس کا اپنا جغرافیہ ہوتا ہے۔ قوم کے ساتھ زبان و ادب کے تصورات اور رسم و رواج وابستہ ہوتے ہیں جب کہ وطن ان تمام باتوں سے متصف ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مخصوص جغرافیائی دائرہ بھی رکھتا ہے۔ اس طرح قوم ایک اجتماعی تصور ہے جب کہ وطن اجتماعی بھی ہے اور انفرادی بھی۔ وطن کے ساتھ زبان، نسل جیسی چیزیں عموماً وابستہ نہیں کی جاتیں ہر شخص کو اپنے وطن کی ان ساری چیزوں سے پیار ہوتا ہے جو وہاں موجود ہوتی ہیں چاہے وہ اس کے اپنے ذاتی عقائد کے مغائر ہی کیوں نہ ہو۔ وطن کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ مذہب ایک طرز فکر ہو سکتا ہے اور اس کی بنیاد عقائد پر ہوتی ہے لیکن وطن ایک محسوس حقیقت ہے۔

حب الوطنی یا وطن سے محبت ایک فطری بات ہے

The Encyclopedia Dictionary - Eng-Ara-Hindi Dictionary
Edited by Alan Kumar El Bakkouche in 2014
PDF created on 2015-04-11

"ملک کا وفادار شہری وہ شخص ہوتا ہے
وطن سے محبت رکھتا اور دکھاتا ہے جو اپنے
آپ کو ملک کی خدمت کے لیئے وقف کر دیتا
ہے اپنے ملک اور اس کے رہنے والوں کی
بھلائی اور ترقی کے لیئے قربانیاں دیتا ہے۔" [1]

اس طرح حب الوطنی ایک ایسا جذبہ ہے جو وطن کے تمام افراد کو ایک مشترکہ رشتے میں باندھنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ یہ وہ وطنی جذبہ ہے جو مذہبی غلبہ سے بالکل آزاد ہوتا ہے۔

ویبسٹر یونیورسل ڈکشنری میں حب الوطنی کے معنیٰ
"اپنے ملک سے وفاداری اور اس سے محبت" [2] کے ہیں۔

آکسفورڈ عربی انگلش ڈکشنری میں حب الوطنی کے معنیٰ
"الوطنیۃ - حب الوطن" [3] ہیں۔

---

[1] Webster Universal Dictionary WYLD

[2] Webster Universal Dictionary WYLD

[3] Oxford Arabic - English Dictionary of Current Usage

ڈکشنری آف پولیٹکل تھاٹ میں اس پر ذرا تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

"ملک سے محبت ایک موہوم سی اصطلاح ہے جس کو کئی مفاہیم و مطالب میں استعمال کیا جا سکتا ہے جس طرح 'محبت' اور 'وطن' کی تعریف ممکن نہیں اسی طرح حب الوطنی کی تعریف بھی دشوار ہے۔ کبھی کبھی اس کو قوم پرستی سے بالکل الگ سمجھا جاتا ہے اس لیے سوویت یونین کے دستور کا مرکزی نقرہ ہے کہ تمام سوویت شہری وطن پرست ہیں اور بین الاقوامیت کو مانتے ہیں اس سے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا وطن پرستی قوم پرستی کے مقابلے میں کچھ زیادہ واضح ہے یا یوں کہا جا سکتا ہے کہ ملک یا وطن کا مطلب وہاں کے قوانین، حکومتی ادارے اور وہاں کے روایات اور رسوم و رواج ہے۔ محبت کا مطلب نہ صرف ان چیزوں

سے لگاؤ ہے بلکہ ان کی مدافعت بھی ہے وہ
بھی اس حد تک کہ جان کی بھی پرواہ نہ کی جائے۔
کچھ لوگوں کے نزدیک حب الوطنی کا مطلب ایک
ایسا اعلیٰ جذبہ ہے جس میں وطن کی سالمیت سے
وفاداری کا اظہار ہو۔ چناں چہ بولینی بروک
کہتا ہے کہ وطن پرستی کا عمل اور سالمیت دونوں
مشروط ہیں یعنی جس ملک میں ریاست یا
انتظامیہ اور سماج، سوسائٹی یہ دونوں
معروفی ہیں۔

عموماً طور پر ایک حب الوطن اپنے وطن
کے نہ صرف اداروں کی عزت کرتا ہے بلکہ خاص
طور پر ان لوگوں کو بھی جو، ان اداروں کے
پابند ہوتے ہیں اور ان کی اپنی زبان، تاریخ اور
ثقافت ہوتی ہے اس کے علاوہ حب الوطنی
میں ملک کے حدود اور اپنے ملک کے پس منظر
میں خود مکتفی ہونے کے جذبات بھی شامل ہیں

جہاں تک یہ جذبات کبھی کبھی کسی جگہ یا ماحول
کے لیئے "Nostelgia" یا یاد ماضی کا سبب بن
جاتے ہیں تب حب الوطنی اور اس کے تحت
پرورش پانے والے جذبات کو سمجھنا اور قوم
پرستی سے جدا کرنا کٹھن ہو جاتا ہے اگر اس
میں کوئی خط فاصل کھینچا جاسکتا ہے تو صرف
اتنا ہی جیسے ایک حقیقی یا فطری اور مصنوعی
جذبہ میں امتیاز بہ ظاہر مشکل ہوتا ہے۔" [1]

اس طرح اپنے ملک و قوم کی بہبودی و بقاء کے لیئے سنجیدگی و فراخ
دلانہ تعصب کے بغیر مل جل کر کام کرنا ہی حقیقی حب الوطنی ہے لیکن
غیر مناسب طریقہ سے زیادہ مراعات یا فوقیت حاصل کرنے کی
کوشش درست نہیں۔ کیوں کہ یہ ایک انتہا پسندانہ اقدام ہوگا اور
یقیناً ایک زہر کا اثر کرے گا۔ اس کے علاوہ ایسا عمل جو صرف کسی
خاص فرقے یا ذات یا کسی خاص زبان بولنے والوں کی طرف داری

---

[1] Dictionary of political Thought Roger Scruton, Pan Books London 1982

اور وہ بھی اس طرح کہ دوسرے فرقے، ذات یا زبان والوں کی حق تلفی ہو یا ان کا استحصال ہو کبھی مناسب نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اس کا مطلب اپنے ملک سے محبت نہیں بلکہ دوسرے ملک و قوم سے نفرت ہوگا۔ اپنے ملک سے محبت کا نتیجہ دوسرے ملک سے نفرت نہیں ہونا چاہیے جس سے سوائے خوں ریزی کے اور کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔

جدید قومیت کے اثر سے حب الوطنی کا جو تصور ابھرا اس پر گفتگو کرتے ہوئے ڈاکٹر رادھا کرشنن نے وارننگ دی تھی کہ وطن پرستی کو انسان کا اعلیٰ ترین آئیڈیل سمجھنا ٹھیک نہیں ہے۔ [1] مہاتما گاندھی نے بھی عالمی برادری کو مستحسن قرار دیتے ہوئے وطن دوستی اور جارحانہ وطن پرستی کا فرق سمجھایا تھا اردو والوں کے خیالات بھی ان سے کچھ الگ نہ تھے مثلاً سیماب نے لکھا کہ

"میں بنی نوع انسان کو ایک سمجھتا ہوں اور وطنیت کے اس ناپاک تصور کو جو خود غرضی تنگ نظری اور منافرت پر مبنی ہے انتہائی حقارت کی نظر سے دیکھتا ہوں۔" [2]

[1،2] "قومی تعمیر کی دستاویز" ڈاکٹر عبدالاحد ص ۲۵۴

جگن ناتھ آزاد رقم طراز ہیں "وطن پرستی میں جوش اور ہوش کا امتزاج ضروری ہے تاکہ انسان اپنے وطن کی محبت میں اتنا دیوانہ نہ ہو جائے کہ دوسرے کے وطن کو لوٹ کر مار دے اگر احتیاط نہ کی جائے تو وطن پرستی کا جوش ایک ہولناک صورت اختیار کر جاتا ہے اور اپنوں سے محبت غیروں سے نفرت کا سبق دینے لگتی ہے۔" [1]

علی سردار جعفری نے بھی یہی بات کہی ہے کہ "قوم پرستی اور وطن پرستی خوبصورت جذبے اس وقت بنتے ہیں جب ان میں عام بنی نوع انسان کی محبت کی شیرینی حل ہو گئی ہو۔" [2]

علامہ اقبال نے کہا ہے کہ "ہر انسان اپنی جنم بھومی سے محبت رکھتا ہے اور حتی المقدور اس کے لیئے قربانی دیتا رہتا ہے۔ وطن کی محبت کا جذبہ ودیعت خداوندی ہے جس کی نشو نما کے لیئے بیرونی اثرات کی کچھ ضرورت نہیں۔" [3]

جوشؔ کہتے ہیں

"میں تمام نوع انسانی کو ایک خاندان سمجھتا

[1,2,3] "قومی تعمیر کی دستاویز" ڈاکٹر عبد الاحد ص ۲۵۴

ہوں اور دیکھنا چاہتا ہوں وطنیت کے
اس ناپاک تخیل کو جو خود غرضی، تنگ نظری
منافرت اور ابن آدم کی تقسیم چاہتا ہے انسانی
حقارت کی نظر سے دیکھتا ہوں لیکن اس قدر
وطنیت میرا ایمان ہے کہ اپنے گھر کو غاصبوں
کے تسلط سے محفوظ رکھا جائے۔" [1]

حب وطن ایک فطری جذبہ ہے ہر شخص اپنے ہم وطنوں سے الطاف و اخلاص سے پیش آتا ہے اگر سارے معاشرے کو ایک خاندان تصور کر لیا جائے تو اس کیفیت میں نکھار آئے گا جس طرح ہر فرد دوسرے افراد خاندان کے دکھ درد یا خوشی و مسرت میں شریک ہوتا ہے اسی طرح ہم وطنوں میں باہمی مروت پیدا ہو گی۔

حب الوطنی کا جذبہ یقیناً ایک الوہی جذبہ ہے لیکن کبھی کبھی یہ جذبہ جب شدت اختیار کرتا ہے اور وطن پرستی یا قوم پرستی کا اندھا جنون دوسری اقوام، علاقوں، نسلوں اور مذاہب کو تباہ کرنے کے درپے ہوتا ہے تو وہ تمام نوع انسانی کے لیئے ایک

---

[1] "شعلہ و شبنم" حاشیہ نظم وطن۔ جوش ملیح آبادی ص ۵۸

خطرہ بن جاتا ہے اسے ہم جارحانہ قوم پرستی کہہ سکتے ہیں۔ جرمن اپنے آپ کو آرین نسل سے تعلق رکھنے والی عظیم ترین قوم خیال کرتے تھے اور ان کا تصور یہ تھا کہ ساری دنیا پر حکومت کرنے کا حق صرف انھیں ہے وہ اپنی عظمت کا ڈنکا دنیا کے کونے کونے میں بجا دینا چاہتے تھے اگر انھوں نے اپنے قوم پرستانہ جذبات کو اور حب الوطنی کے تصورات کو اپنے علاقے کی حد تک محدود رکھا ہوتا تو دنیا جنگ عظیم کی لپیٹ میں کبھی نہ آئی ہوتی۔

حب الوطنی کے جذبہ کا اپنی حد سے تجاوز کرنا جارحیت کی طرف مائل کرتا ہے کیوں کہ ایسی صورت میں اندھی محبت اور عقیدت جنون بن کر عقل، فہم، ہمدردی اور رحم پر غالب آجاتی ہے۔ اور پھر نت نئی نفسیاتی پیچیدگیاں جنم لیتی ہیں۔ انسانی نفسیات کی یہی کارفرمائی ہم کو پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے پیچھے نظر آتی ہے جو لاکھوں انسانوں کی موت کا سبب بنی تھیں۔ تفوق کا جذبہ اور اپنی نسل، اپنے مذہب اپنی زبان کو اعلیٰ ترین سمجھنا دراصل ان خرابیوں کی جڑ ہے جو بعد میں انسانی معاشرے کو تباہی کی طرف لے جاتا ہے۔ وطن سے اس درجہ محبت کرو وہ خدا کا درجہ حاصل کرلے

یا پھر قومیت کو اتنا اہم قرار دینا کہ دنیا کی ہر شئے خصوصاً لطیف انسانی جذبات بھی اس کے آگے ہیچ سمجھے جانے لگیں تو یہ عصبیت پیدا کرتے ہیں جو ذہن انسانی کی ایک بیماری ہے یہ عصبیت دوسری اقوام نسلوں، مذاہب وغیرہ سے شدید نفرت پیدا کرتی ہے۔ اس احساس کا محرک دراصل اقتدار کا نشہ ہے جو خود پرستی کو جنم دیتا ہے اور یہ خود پرستی دوسروں کے لیئے تباہی کا باعث بنتی ہے جیسے جاپان اور جرمنی ایک زمانے میں ایشیا اور یورپ کے لیئے ایک عظیم خطرے کی شکل اختیار کر گئے تھے لیکن غرور کبھی سربلند نہیں ہو سکتا۔ قومی غرور میں مبتلا ان دو اقوام کو بہر حال شکست کا سامنا کرنا ہی پڑا۔ خود یہاں ہندوستان میں ہندیانے یا Indianisation کا نعرہ دیئے جانے کے پیچھے یہی جذبہ کار فرما ہے جو نفرت کی آگ کو بھڑکاتا ہے احساس تفوق پیدا کرتا ہے اور نتیجتاً خانہ جنگی کی سی کیفیت کے پیدا ہونے کا امکان نظر آنے لگتا ہے۔

کسی کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ وطن پرست نہیں ہے اس کے لیئے گالی کے مترادف ہے جو شخص انسانی اقدار کو عزیز رکھے گا وہ وطن پرست بھی ہوگا اس طرح سچی وطن پرستی انسان

دوستی ہی میں مضمر ہے۔

کچھ دانشوروں کا خیال ہے کہ کبھی کبھی بین الاقوامیت انسان دوستی سے ٹکرا جاتی ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو ایک محب وطن انسان دوستی کا مخالف ہو ہی نہیں سکتا کیوں کہ اگر وہ اپنے وطن کی حفاظت کرتا ہے اور اس حفاظت میں اسے اپنے ملک سے ٹکرانا پڑتا ہے تو یہ کوئی خلاف آئین یا خلاف انسانیت حرکت نہیں کیوں کہ کسی دوسرے کے ملک پر قبضہ کرنا ایک ایسا فعل ہے جو ہر تہذیب، ہر مذہب اور ہر مکتبہ فکر میں قابل مذمت ہے اور بین الاقوامیت کا تصور اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک کہ خود اپنے وطن کا تعین اور اپنی سرزمین سے محبت کا تصور پختہ نہ ہو یہی تصور جب وسیع ہو جاتا ہے تو سارے کرۂ ارض کو اپنے دائرے میں سمیٹ لیتا ہے یہی بین الاقوامیت ہے۔ اس کو یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ اگر اس سرزمین کے علاوہ کچھ اور دنیائیں ہیں جیسا کہ سائنسدانوں کا خیال ہے تو پھر ان دنیاؤں کے مقابلے میں انسان یقیناً اپنی دنیا سے محبت رکھے گا اور یہاں وطن کا وہ جغرافیائی تصور برقرار نہ ہوگا بلکہ سارا کرۂ ارض وطن قرار پائے گا۔

دوسرا باب

شاعری میں حب الوطنی کی نشاندہی انیسویں صدی تک

(i) دکنی شاعری میں حب الوطنی کے اثرات

(ii) دہلی کی شاعری میں حب الوطنی کے اثرات

(iii) لکھنؤ کی شاعری میں حب الوطنی کے اثرات

اگر ہم ہندوستان کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اس دھرتی نے ہر اس قوم اور قبیلہ کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا جس نے اس دھرتی کو اپنا وطن جانا اور یہاں بود و باش اختیار کی۔ آریا ہوں کہ یہودی، یونانی ہوں کہ ملمان، الگ الگ مذہب و ملت اور مختلف اقوام کے لوگ یہاں آکر آپس میں اس طرح گھل مل گئے کہ ان کے درمیان مذہب، زبان اور رسم و رواج کے فاصلے کم سے کم ہوتے گئے۔ اس اختلاط اور میل جول نے ایک ایسی تہذیب کو پروان چڑھایا جو مشترکہ تہذیب تھی۔

باہر سے آنے والے آریاؤں نے یہاں کے مقامی باشندوں کو اگرچہ کم تر سمجھا لیکن غیر شعوری طور پر ان کے مذہب کے بہت سے رسم و رواج ان پر اثر انداز ہوئے۔ مقامی دراوڑی لوگوں نے آریاؤں کے دھرم سے ناشناسی کے باوجود ان کی بہت سی باتیں قبول کر لیں۔ نئی مذہبی اور روحانی تحریکیں مہاویر سوامی کے جین مت اور گوتم بدھ کے بودھ دھرم کی صورت میں نمودار

ہوئیں اور یہ تحریکیں عرصہ دراز تک عوام پر اثر انداز ہوتی رہیں۔

آریاؤں کے بعد یہودیوں کے چند قبیلوں نے ہندوستان کا رخ کیا اور کیرالا، آسام میں بود و باش اختیار کی وہاں انھوں نے عبادت گاہیں تعمیر کیں۔ اس بات کے بھی شواہد موجود ہیں کہ عیسائی مذہب کے ماننے والے پہلی صدی عیسوی میں ہندوستان کے مغربی ساحل پر آباد ہو چکے تھے۔ ایران کے مجوسی (پارسی) بھی گجرات اور اس کے اطراف میں آ بسے تھے۔ اس طرح مختلف مذاہب کے ماننے والے اور مختلف قوموں سے تعلق رکھنے والے ہندوستان میں آباد ہو چکے تھے اور اپنے اپنے رہن سہن اور رسم و رواج کے باوجود ایک دوسرے سے متاثر ہونے کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔

مسلمانوں کی آمد نے اس ملی جلی تہذیب کو کچھ اور جلا بخشی۔ یوں تو اہل عرب زمانہ قدیم سے ہی ہندوستان سے بخوبی واقف تھے اور سمندری راستوں سے تجارت کے سلسلے میں اکثر ادھر آتے رہتے تھے۔ ان کے باقاعدہ قیام اور بود و باش کے متعلق کچھ کہنا دشوار ہے لیکن اسلام کے اولین عہد میں جو مسلمان اس طرف آئے ان کے بارے میں تاریخی حقائق ملتے ہیں۔

ہندوستان میں سب سے پہلی مسجد ان ہی مسلمانوں نے ملابار کے ساحل پر تعمیر کی، گھر بنائے اور یہیں بود و باش اختیار کی یہ اس وقت کی بات ہے جب محمد بن قاسم نے ہندوستان کا رخ نہیں کیا تھا۔

مسلمانوں کی باقاعدہ آمد محمد غوری سے شروع ہوتی ہے جو آریاؤں کی طرح فاتح بن کر آئے لیکن انھیں یہاں کی آب و ہوا ایسی راس آئی کہ یہیں کے ہو رہے۔ آریاؤں کے بعد جس تہذیب نے اس ملک کو سب سے زیادہ متاثر کیا وہ ان مسلمانوں کے ساتھ آنے والی اسلامی تہذیب تھی۔ ان دونوں تہذیبوں سے ہم آہنگ ہو کر ایک نئی تہذیب نے جنم لیا جسے "ہندوستانی تہذیب" کہتے ہیں۔ اس تہذیب نے بھائی چارے، محبت و رواداری اور ایک دوسرے کے مذہب کا احترام سکھایا اور ہندوستان کو ایک بڑی زبان اردو عطا کی جس نے سارے ملک کو اپنی شیرینی اور لطافت سے متاثر کیا۔

اردو شاعری کا خمیر چوں کہ ہندوستان کی مٹی سے اٹھا ہے اس لیے اس میں یہاں کے رسوم و روایات، معاشرتی آداب، میلے، تہوار سب دیکھے جا سکتے ہیں اس کی بڑی

ابھی مثالیں غزل میں تو ملتی ہی ہیں لیکن قصیدے اور مرثیے میں بھی پائی جاتی ہیں۔ اس طرح اردو شاعری ہر دور میں اپنی تہذیب کی نمائندگی کرتے ہوئے وطن سے محبت کا فرض ادا کرتی رہی۔

امیر خسرو کو اردو شاعری کے آغاز کے سلسلے میں نقطۂ اول قرار دیا جاتا ہے۔ خسرو فارسی شاعری کے ذریعہ ہندوستان کی عظمت کا راگ الاپتے ہیں تو دوسری طرف انھوں نے کہہ مکرنیاں، پہیلیاں، دوہے وغیرہ بھی لکھے[1] جو زبان و بیان اور خیالات کے اعتبار سے خالص ہندی ہیں۔ ان کی مثنوی "قرآن السعدین" میں ہندوستان کی عظمت کی فضا چھائی ہوئی ہے۔ انھیں ہندوستانی پھول ایرانی پھول سے بہتر نظر آتے ہیں وہ بیلا، چنبیلی، چمپا، نیلوفر، جوہی، کیوڑہ، سیوتی اور مولسری کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ وہ چمپا کو پھولوں کا بادشاہ قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہندوستان کے ایسے پھول اگر روم اور شام میں ہوتے تو وہاں کے لوگ ان کی تعریف دنیا میں کرتے پھرتے۔ وہ ہندوستان کے ریشمی کپڑوں کو دوسرے تمام ممالک کے کپڑوں سے بہتر سمجھتے ہیں۔

---

[1] بعض محققین نے امیر خسرو سے منسوب کلام کو کسی اور شاعر (ضیاء الدین خسرو) کا قرار دیا ہے۔

خسرو اپنی حب الوطنی کا اظہار اس طرح کرتے ہیں۔

بہشتے عرض کن ہندوستان را
کرنا بنا نشیش این بوستاں را

ترک ہندوستانیم من ہندوی گویم جواب
شکرے مصری ندارم کز عرب گویم سخن
وین ز رسول آمدہ کای زمرۂ دیں
حب وطن ہست ز ایماں بہ یقیں

انھوں نے ایک اور مثنوی "نہ سپہر" لکھی اس میں ہندوستان کی تعریف میں ایک باب ملتا ہے اس میں وہ لکھتے ہیں اگرچہ روم و یونان کا نام حکمت میں مشہور ہوا اور ان کا فلسفہ سارے عالم میں پھیل گیا مگر اہل ہند کا دامن اس سے خالی نہ تھا ہندوستان میں ایک سے ایک دانشور ہوئے ہیں۔ منطق، نجوم علم کلام غرض کہ سبھی علوم ہند میں موجود ہیں۔ ایسے ایسے پنڈت یہاں پائے جاتے ہیں کہ علم و دانش کے میدان میں یونانی فلسفی ارسطو کا دفتر چاک کر دیں۔ طبیعات، علم دیافی، قدیم و جدید

ہیئت سب یہاں موجود ہے۔

اس طرح وصف ہنگام سحر، وصف در علوم وفنون باغ کی توصیف، ہندوستانیوں کے رنگ وحسن پر، وصف مطربان ہند اور تعلق نامہ سے ان کی ہندوستان سے محبت کا اظہار ہوتا ہے۔ خسرو کی حب الوطنی کے متعلق ظ انصاری لکھتے ہیں

"مادر وطن ہندوستان سے ان کی الفت

پاٹ دار دریا کی ایک موج ہے یہ موج

اس لیئے متلاطم ہو گئی کہ نو وارد

ولایتی خاتمانہ رعونت میں آئے دن

ہندوستانی ماحول، کلچر اور اہل قلم پر

طنز کیا کرتے تھے ان کے جہل کی حقیقت

جاننے کے علاوہ خسرو نے چاروں کھونٹے

گھوم کر مفتوح، مغلوب اور تباہ حال

ہندوستان کی صناعی، باریکی، ذہنی اور فنی

کمال، تہذیبی گہرائی اور رنگا رنگی کے

جلوے دیکھ لیئے پھر یہ جانا کہ چھوٹے چھوٹے

رجواڑوں اور تہذیبی اکائیوں کو
بزورِ شمشیر مٹا کر تاراج کر کے جو
سیاسی اور انتظامی وحدت قائم ہوئی
تھی وہ دیر پا نہیں نکلی۔" [1]

اس طرح امیر خسرو کی شاعری کے ذریعہ اردو شاعری میں حب الوطنی کی بنیاد پڑی۔

---

[1] "خسرو کا ذہنی سفر" ظ انصاری ص ۲۰

جب ہم دکنی شاعری کے ابتدائی نمونوں کا جائزہ لیتے ہیں تو ان پر حب الوطنی کے جذبات غالب نظر آتے ہیں۔ عادل شاہی اور قطب شاہی دور میں دکنی شاعری کو کافی فروغ حاصل ہوا۔ ان دونوں سلطنتوں کے مراکز بیجاپور اور گولکنڈہ اردو شاعری اور ادب کے مرکز بھی تھے۔

دکن میں تقریباً سبھی اصناف سخن کی تخلیق ہوئی تاہم وہاں "مثنوی" نے زیادہ فروغ حاصل کیا۔ مثنوی کی تخلیق کے لیئے ایسے سازگار ماحول کی ضرورت ہوتی ہے جس میں امن و امان خوشحالی و فارغ البالی کا دور دورہ ہو اور یہ سازگار ماحول دکن میں میسر تھا۔ شعراء کا خاص میلان واقعہ نگاری کی طرف ہونے کی وجہ سے مرثیہ، رزم نامہ اور داستان گوئی ان کی شاعری کے خاص میدان تھے۔ سچے تاریخی رزم ناموں اور جنگ ناموں سے ان کی دلچسپی اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اپنے ماحول سے متاثر ہوتے رہے اور انھیں اپنے ارض وطن سے محبت تھی۔ دکنی شاعروں نے عشقیہ مثنویوں

میں بھی جنگ و پیکار کے مناظر دکھائے ہیں۔ ان مناظر کے ساتھ شعرا نے اپنے ماحول کی عکاسی کی ہے۔ ملا وجہی کی "قطب مشتری" محمد قلی قطب شاہ کے دور کی تہذیبی اور معاشرتی ماحول کی ترجمانی کرتی ہے۔ وہ حب الوطنی کا اظہار بھی کرتا ہے۔

دکھن سا نہیں ٹھار سنسار میں — پنج فاضلاں کا ہے اس ٹھار میں
دکھن ہے نگینہ انگوٹھی ہے جگ — انگوٹھی کوں حرمت نگینہ ہے لگ
دکھن ملک کوں دھن عجب ساج ہے — کہ سب ملک سر ہور دکھن تاج ہے
دکھن ملک ہو تیج خاصا اہے — تلنگانہ اس کا خلاصا اہے

محمد قلی قطب شاہ کا کلام اس کی حب الوطنی اور قوم پرستی کا شاہد ہے۔ اس نے دکن کے ذرّے ذرّے سے محبت کی ہے۔ وہ ہندوستانیت کا پرستار تھا۔ خاک وطن کے ہر ذرّہ کو اس نے دیوتا سمجھا اور اظہار محبت میں وطن کی اہم اور غیر اہم ہر شئے سے اس نے اپنی محبت کا اظہار کیا۔ یہاں تک کہ جگنو، کوے، مینڈک اور بیر بہوٹی کو بھی اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔

کوئل : پریم کے بھید بن میں کوئی کوئل
سونا داں سوں پنکھ وسب ریجھائی

راویں (طوطا) بچن اس کے کریں راوی کے سم کیوں
کہ ہے اس بات میں کلدار احوات

جگنا (جگنو) جھمکتا رات کوں جگنا پیاری رات دن جھمکے
پیشانی پر رکھے جگن کا ٹیلا کہ نادیکھیا کے [1]

وہ اپنے ملک کو آباد اور خوشحال دیکھنا چاہتا ہے اور ملک کی ترقی و فارغ البالی کی دعائیں مانگتا ہے

آباداں کر ملک مرا سوتوں
بسا سوتوں دے مرا من یا سمیع
میرا شہر لوگاں سوں معمور کر
رکھیا جوں توں دریا منے من یا سمیع [2]

وطن سے محبت اور اس کی تہذیب و روایات سے وابستگی اس کی رگ و پے میں سرایت کر گئی تھی۔ دکن کے رسوم و عقائد، رہن سہن، وضع قطع اور پوری سماجی و تہذیبی زندگی کے مرقعے اس کی شاعری میں نظر آتے ہیں۔

---

[1] "کلیات محمد قلی قطب شاہ" مرتبہ ڈاکٹر سیدہ جعفر ص ۱۳۶
[2] "کلیات محمد قلی قطب شاہ" مرتبہ ڈاکٹر سیدہ جعفر ص ۳۱۳

حب الوطنی کے جذبہ کو طبقی نے اس طرح پیش کیا ہے

جو کوئی یاد کرتا نیتی اپنا وطن　　ادمرا ہے پیرن ہے اس کا کفن
اگر کوئی غربت میں شاہی کرے　　اگر مال ہو ملک لاکھاں دھرے
اپس کوں دیکھے کھول کر جوں آنکھاں　　دیوے خاک تن کا وطن کا نشاں
وطن سب کو دنیا میں پیارا اہے　　سفر ہے سو جوں باد باراں اہے [1]

دکنی شعراء نے اپنے ماحول کی سیاسی صورت حال کو بھی پیش کیا ہے۔ نفرتی کی رزمیہ مثنوی "علی نامہ" علی عادل شاہ کے عہد حکومت کے چند اہم واقعات پر مبنی ہے۔ باپ کی وفات پر علی عادل شاہ ثانی کی عمر ۱۸ سال تھی۔ امراء میں حسد و رقابت کی آگ بھڑک رہی تھی سرحدی صوبوں پر بغاوتیں نمودار ہو رہی تھیں اس پر اورنگ زیب کی چڑھائی اور بعض عادل شاہی امراء کی غداری نے طرح طرح کی پیچیدگیاں اور پریشانیاں پیدا کر دی تھیں تاہم بیجاپور برابر مقابلہ کرتا رہا اتنے میں اورنگ زیب کو دکن کی مہم چھوڑ کر دہلی جانا پڑا وہاں تخت و تاج اس کے انتظار میں تھے اس سے بیجاپور کو دم لینے کا موقع مل گیا۔ علی عادل شاہ نے بڑی ہمت

---

[1] "تحریک آزادی میں اردو کا حصہ" ڈاکٹر معین الدین عقیل ص ۱۱۵

اور ہوشیاری سے کام لیا اور اپنی حکومت کو سنبھال لیا۔ وہ خود میدان جنگ میں آیا شیواجی کی بڑھتی ہوئی قوت کو روکا۔ کرنول کے حبشی سرداروں کو نیچا دکھایا۔ راجا بدنور کی سرکوبی کی اور آخر میں مغلوں کے فوجی سیلاب کو جو جے سنگھ کی سرکردگی میں بڑھتا ہوا چلا آرہا تھا پیچھے ہٹایا۔ اس مثنوی میں ان ہی مہمات کا تذکرہ ہے۔

محمد عادل شاہ کے مرنے اور علی عادل شاہ ثانی کی تخت نشینی کے وقت ملک کی کیا حالت تھی اس کا نقشہ نفرتی نے اس طرح کھینچا ہے کہ تاریخ سے اس کی حرف بہ حرف تصدیق ہوتی ہے۔

کہ القصہ یو بادشاہی کے کام — درست ہوئیں لگ اور غنیماں تمام
ننھے ہور بڑے تھے سو سب بد نہاد — اُپائے وہ چاروں طرف سے فساد
مخالف تو اکثر منافق ہوئے — موافق بی کے ناموافق ہوئے
بڑی رج کی شہ اپنے کم سن منے — نوی بادشاہی نوے دن منے
ولے شاہ ہمت سوں رکھ دل قوی — نوے کام پر کر تردد نوی
اگن پن وہ فتنے کی چوندھیر سوں — اٹھی تھی وہ شمشیر کے تیر سوں

اسے یک طرف تھے بہا دیں تلگ اٹھے بی وہ دسرے رخن تھے سلگ [1]

ابوالحسن تاناشاہ کے دور میں دکن تہذیبی اور سیاسی طور پر ایسے انقلاب سے دوچار ہوا جس نے اس سرزمین کی تہذیب و ثقافت اور علم و ادب کی بنیادیں ہلا دیں۔ اہل گولکنڈہ اور بیجاپور اس انقلاب سے اتنے متاثر ہوئے کہ پچاس سال تک سنبھل نہ سکے۔ ابوالحسن تاناشاہ کی شکست اور قید کے بعد بیشتر ایسے شاعر اور ادیب یہاں سے نکل گئے جو قدردانی کی وجہ سے یہاں مقیم تھے۔ لیکن بہت سے شاعر ایسے بھی تھے جو اپنا وطن چھوڑ کر کہیں نہ جا سکے۔ وہ اپنے شہر کی تباہی اور اپنی لاچاری پر آخر وقت تک نوحہ کناں رہے۔ وہ اورنگ زیب کے

ڈر سے اپنے جذبات و خیالات کو اعلانیہ ظاہر نہیں کر سکتے تھے اس لیے انھوں نے مرثیہ گوئی کو اپنایا۔ وہ اپنے وطن کے غم کو حضرت امام حسینؑ اور شہدائے کربلا کے مرثیے لکھ کر ظاہر کرتے رہے۔ یعنی شعراء نے مرثیوں کو اپنے سیاسی جذبات کے اظہار کا آلۂ کار بنایا تھا۔ بعض مرثیوں میں محض ایک آدھ لفظ کی تبدیلی سے ان کا مقصد یعنی تباہی وطن کی مرثیہ نگاری ظاہر ہو جاتا ہے جیسے روحی کے مرثیے کا یہ حصہ

---

[1] "نصرتی۔ ملک الشعرائے بیجاپور کے حالات و کلام پر تبصرہ" مولفہ مولوی عبدالحق ص ۹۹

آج غم ناک ہیں چمن کے گل　　بلکہ دل چاک ہیں سمن کے گل
غم زدہ سینہ داغ حیراں ہیں　　نرگس و لالہ یاسمن کے گل
یوں نہ لالے شفق کے دستے ہیں　　لہو میں ڈوبے ہیں سب گگن کے گل
جب سنے شہ کی بات مجلس میں　　جل بجھے شمع انجمن کے گل [1]

اس مرثیے کے پہلے مصرعے میں اگر چمن کے بجائے دکن کا لفظ لکھ دیا جائے تو پورا مرثیہ ابوالحسن تاناشاہ کا مرثیہ بن جاتا ہے۔

روحی کے علاوہ اس دور کا ایک اور قابل ذکر شاعر مرزا ہے جو ابوالحسن کا درباری شاعر تھا۔ جب ابوالحسن قید ہوا اور حیدرآباد کو مغل فوجوں نے لوٹ لیا تو مرزا نے اس غم میں فقیری اختیار کرلی اور گوشہ نشین ہوگیا۔ اسی گوشہ نشینی میں اس نے مرثیہ لکھا جس کے چند شعر یہ ہیں۔

یہی نہ تنہا لباس نیلا ہے، سب محباں کے تن میں غم تھیں
سیاہ پھیرا ہے پتلیوں نے ازل سوں جگ کے نین میں غم تھیں
ملا تھا بلبل سوں میں سحر گہ سناہوں احوال گلستاں کا
نہیں ہے کوئی گل بغیر نرگس ولے ہے گریاں چمن میں غم تھیں

---

[1] "تحریک آزادی میں اردو کا حصہ"، ڈاکٹر معین الدین عقیل ص ۱۱۹

خطا کا احوال مشک کہنا ہے جب سوں پہنچی ہے یہ خبر وہاں
ہوا ہے سودا سوں جل کے کالا لہہ غزال ختن میں غم تھیں
خبر محباں کی اشک ریزی کی جب بدخشاں سوں گئی عرب میں
عقیق جتنے تھے سب لہو ہو کے بہہ چلے ہیں یمن میں غم تھیں [1]

اس دور انتشار کا ایک اور بڑا شاعر بحری تھا جس کی مثنوی "من لگن" ادبی اہمیت رکھتی ہے۔ وہ گولکنڈہ کا رہنے والا تھا۔ اپنے وطن سے بیجاپور اس وقت پہنچا تھا جب مغلوں نے اس کا محاصرہ کر رکھا تھا اور آخر کار جب وہ اجڑ گیا تو وہ حیدرآباد چلا گیا لیکن مغل افواج نے اسے بھی تباہ کر دیا چنانچہ وہ حیدرآباد سے بھی کسمپرسی کے عالم میں نکل گیا۔ اس کا ان تباہیوں اور اپنی محرومیوں سے متاثر ہونا فطری امر تھا۔ اپنے ان تاثرات کو وہ "من لگن" میں "در شکایت روزگار" عنوان کے تحت رقم کیا ہے۔ اس کے چند شعر درج ذیل ہیں۔

اے بھائیو بارہویں صدی ہے　　نیکی کو دبا بدی بدی ہے
ہے آج تو قحط سال ست کا　　جھٹکیا ہے دھرم سوں دل جگت کا
الٹا گیا ہے صاف جگ تے　　ہور عدل کی دوپٹہ لاف جگ تے

---

[1] "تحریک آزادی میں اردو کا حصہ" ڈاکٹر معین الدین عقیل ص ۱۲۰

دھرتی پہ ادھرم اگر بڑھا ہے | امرت کے بجائے بک ہوا ہے
ناجائی کو ماں مائی کا بھروسا | نالائق کو بھائی کا بھروسا
ناشرم کی خو ہے یک نین میں | نادھرم کی بو ہے یک بدن میں
پورب کی طرف اگر چلے پیر | تو جائے مبرید اٹھ دکنا دھیر
سنسار میں ہے جو سرد ہو گرم | سو پیر پہ سب دسے پر اُرم
اس ہول میں تو ہوا ہے پیدا | اس ڈول میں تو ہوا ہو پیدا
اب جیونے سے بھلا ہے مرنا | بہتر ہے جو بے ازل گزرنا [1]

اس دور میں چند ایسے شاعر بھی گزرے ہیں جو اپنے زمانے کے سیاسی انقلابات کے تاثرات کو زائل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ ان میں ضعیفی کا نام آتا ہے۔ اس کی ایک مثنوی کے آخری باب کی تیسری فصل میں اورنگ زیب کی مدح اس طرح ہے جس میں حب وطن کے جذبات بھی روایتی انداز سے بیان ہوئے ہیں۔

یہ دور جہاں دار اورنگ زیب | کہ جس تے ہوا اس زمانے کوں زیب
دیا سر پہ جو پن شہی کا وہ تاج | دلی ہور دکن کا ہوا ایک راج [2]

---

[1] "من لگن" مصنفہ قاضی محمود بحری قدس سرہ مرتبہ محمد سخاوت مرزا۔ ص ۲۳
[2] "تحریک آزادی میں اردو کا حصہ" ڈاکٹر معین الدین عقیل ص ۱۲۳

دکن کے ایک اہم شاعر ولی کا ذکر ضروری ہے۔ اس کی شاعری میں اجتماعی ماحول کی ترجمانی نمایاں ہیں اس کا ثبوت خود اس کا یہ شعر ہے۔

ہرگز ولی کے پاس تم باتاں وطن کی مت کہو
جو نیہ کے کوچے میں ہے اس کو وطن سے کیا غرض [1]

ولی اپنے ماحول پر یوں نظر ڈالتا ہے۔

ملک ہرگز نہیں رہے آباد تخت سیں جس کے شہریار گیا
ملک دل کے خراب کرنے کوں شاہ ہے فوج ہے نقارہ ہے [2]

ولی کا وطن اورنگ آباد تھا۔ اورنگ زیب کی لشکر آرائیوں کی وجہ سے جوں کہ وہاں علم و ادب کے لیئے مرکزیت باقی نہ رہی تو ولی نے گجرات کا سفر اختیار کیا۔ اور جب اسے گجرات سے بھی سفر کرنا پڑا تو اس نے گجرات کے فراق میں غزل لکھی اس کے چند شعر یہ ہیں۔

---

[1] "کلیات ولی" مرتبہ جناب علی احسن، احسن ماہروی ص ۱۱۷

[2] "کلیات ولی" مرتبہ جناب علی احسن، احسن ماہروی ص ۳۲۳

گجرات کے فراق سوں ہے خار خار دل
بے تاب ہے سینے منے آتش بہار دل
ہجرت سوں دوستاں کے ہوا جی مرا گداز
عشرت کے پیرہن کوں کیا تار تار دل
لیکن ہزار شکر ولی حق کے فیض سے
پھر اس کے دیکھنے کا ہے امیدوار دل [1]

اس کی مشہور مثنوی "شہر سورت" کی تعریف میں ہے اس کے چند شعر درج ہیں۔

عجب شہروں میں ہے پر نور یک شہر
بلاشک ہے وہ جگ میں مقصد دہر
اہے مشہور اس کا نام سورت
کہ جاوے جس کے دیکھے سب کدورت
جگت کی آنکھ کا گویا ہے وہ نور
اچھو اس نور سوں ہر چشم بد دور [2]

---

[1] "کلیات ولی" مرتبہ جناب علی احسن، احسن مارہروی ص ۳۷

[2] "کلیات ولی" مرتبہ جناب علی احسن، احسن مارہروی ص ۹۷

وہ غیر ملکیوں کا ذکر نفرت کے ساتھ کرتا ہے۔

فرنگی اس میں اتنے ہیں کلہ پوش
عدد داں جن کی گنتی میں ہے بے ہوش [1]

محبوی حیثیت سے دکنی شعراء نے اپنے کلام میں ماحول اور اس کے سیاسی اور سماجی پہلو کی عکاسی اپنے انداز میں کی ہے چاہے وہ حب وطن کے جذبات ہوں یا سیاسی ابتری و انتشار کی کیفیات۔ اس میں اس ماحول سے آزادی کا رجحان شامل رہا ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہاں علاقائی وطنیت کا رجحان نمایاں ہے اور یہ حب الوطنی کی سبک تر شکل ہے۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ وہ دور ذرائع ابلاغ کی وسعت کا دور نہیں تھا لوگ محدود زاویہ نگاہ رکھتے تھے اور اپنے افق کے اس پار دیکھنا نہیں جانتے تھے ان کا وطن بس وہی علاقہ تھا جس میں وہ رہتے تھے۔ اس زمانے کی مشہور کہاوت ہے "جہاں تن وہاں وطن"۔

اس طرح ان لوگوں نے اپنے علاقے سے محبت کا اظہار ایک طرف تو مثبت انداز میں اس طرح کیا ہے کہ اپنے

---

[1] "کلیات ولی" مرتبہ جناب علی احسن، احسن مارہروی ص ۸۰

گرد و پیش کی ہر چیز سے محبت کا اظہار کیا ہے دوسری طرف یہ
رخ بھی اپنایا ہے کہ اگر کوئی خطرناک اشارہ ہوا ہے ۔ ان کے
تصور وطن کے خلاف ۔ تو انھوں نے اس تصور کی شدت سے
مزاحمت کی ۔ یہاں اس کی وضاحت بے حد ضروری ہے کہ علاقائی
حب الوطنی کا یہ جذبہ کسی طرح وسیع تر ملکی حب الوطنی سے متصادم
نہیں تھا ۔ چناں چہ جب ہم دکن سے شمالی ہند کی طرف چلتے ہیں
تو بڑی حد تک حب الوطنی کا طرز ملتا جلتا نظر آتا ہے ۔

اورنگ زیب کی وفات ۱۷۰۷ء سے انتشار
اور طوائف الملوکی کا دور شروع ہوتا ہے جو ۱۷۵۷ء میں جنگ
پلاسی کو بھی شامل کرتا ہے۔ اس شکست نے ہندوستانیوں کو مکمل طور
پر ضعیف و مضمحل کر دیا تھا اور انگریزوں کے سیاسی اقتدار کے لیے
راستہ ہموار کر دیا تھا۔ پایہ تخت دہلی اس پر آشوب اور عبرتناک
ہنگاموں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ داخلی انتشار نے خارجی حملوں کے لیے
راہ صاف کی اور بیرونی حملہ آوروں کی یلغاروں اور اندرونی
شورشوں اور بغاوتوں نے دہلی کے علاوہ اس کے اردگرد کے
علاقوں، شہروں اور دیہاتوں کو بھی منتشر کر دیا۔ ان پر آشوب
حالات میں افراد کا ایک گروہ ایسا بھی تھا جس کا شعور و احساس
بیدار تھا جو اس سیاسی اور سماجی انتشار پر غور و فکر کر کے اس
سے چھٹکارا پانے کی تدبیریں سوچ رہا تھا۔ علماء میں حضرت شاہ
ولی اللہ اسی عہد میں نہ صرف ہندوستان بلکہ عالم اسلام کی اصلاح
کے منصوبے بنا رہے تھے۔ اس دور کے شعراء بھی اس صورت حال
میں اپنی زندگی کے تلخ ایام گزار رہے تھے لیکن ان کا حساس ذہن اپنے
ماحول اور معاشرے کے اجتماعی انتشار اور اس کی زبوں حالی سے

پوری طرح آگاہ اور متاثر تھا۔

اس عہد کے شعرا نے اپنے عہد کے سیاسی پس منظر کو مختلف اصناف سخن میں بیان کیا ہے۔ غزل میں اپنے زمانے کے ان حالات کا عکس اور اس کا ردعمل صاف نظر آتا ہے۔ شاعر اپنے جذبات و احساسات کی ترجمانی اشارات میں کرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں وہ جہاں گلستان، باغ، چمن، آشیاں، گل و بلبل، قفس و صیاد کی بات کرتے ہیں تو ہم محسوس کر سکتے ہیں کہ وہ کنایتہً اپنے ملک و وطن اپنے احباب اور گھر بار کا ذکر کر رہے ہیں۔ اسی طرح ظالموں اور غارت گروں کو کبھی گلچیں اور کبھی صیاد کا نام دیا اور وطن کے تلازمات کو غنچہ، گل و بلبل سے تشبیہ دی۔ اسی طرح امن و سکون اور خوش حالی کے دور کو بہار سے اور زبوں حالی کو خزاں سے تعبیر کیا۔

اب یہی احسان ہے تیرا جو ہوں آزاد ہم
پھر چمن میں جائیں کیا منہ لے کے اے صیاد ہم
تک تو فرصت دے کہ ہو لیں رخصت اے صیاد ہم
مدتوں اس باغ کے سائے میں تھے آباد ہم

منہ ترا تکتے تھے سب اقلیم حسن و عشق کے
تو ہی بتلا دے کریں کس سے تری فریاد ہم
دل تو ہے داغ غلامی میں تری طاؤس دار
سامنے قمری کے کو ہیں سرو سان آزاد ہم

(نواب امیر خاں انجام)

دلی میں درد دل کو کوئی پوچھتا نہیں
مجھ کو قسم ہے خواجہ قطب کے مزار کی

(شاہ مبارک آبرو)

طرح اسکندر کے تاباں شاہ ہفت اقلیم ہو
گر تنک اک حیرت کرے یہ خسرو ہندوستاں
آگ ہیں باغ میں لالہ زمیں سے
ہوا خون شہیداں سے چمن سرخ
فرش پہ مخمل کے جو سوتے تھے ہائے
اب میسر ان کو نہیں ہوتا ہے ٹاٹ

(میر عبدالحئی تاباں)

اس زمانے میں ہمارا دل نہ ہو کیوں کر اداس
دیکھ کر احوال عالم اڑتے جاتے ہیں حواس
ایسی ہوا چلی ہے کہ چاروں طرف مناد
جز سایۂ خدا کہیں دارالاماں نہیں
کس کے لے جائیں تیرے ظلم کی فریاد ہم
تجھ ہی سے تیرے ستم کی چاہتے ہیں داد ہم
گرم ہے ظلم کا بازار خدا خیر کرے
کہیں مظلوموں کے رونے سے نہ آئے طوفاں
حاتم یہی ہمیشہ زمانے کی چال ہے
شکوہ بجا نہیں ہے تجھے انقلاب کا

(حاتم)

ان اشعار سے سیاسی انتشار اور عدم استحکام کے نتیجہ میں اقتصادی بدحالی اور بے روزگاری کی وجہ سے تہذیبی اور اخلاقی قدروں کا جو انحطاط ہو رہا تھا اس کا بھی احساس ہوتا ہے۔

غزل کا یہ جائزہ دور ایہام گوئی تک محدود ہے
ایہام گوئی کے خلاف مرزا مظہر جان جاناں کی تحریک بڑی اہمیت

رکھتی ہے۔ اردو شاعری کی تاریخ میں غزل کو حقائق حیات سے روشناس کرنے میں اس تحریک کا نمایاں کردار ہے۔

مرزا مظہر نے اپنے دور کے ادبی ماحول پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ انھوں نے خان آرزو کی تحریک کو ایک قدم اور آگے بڑھایا جس کا مقصد شعراء کو اردو میں شعر کہنے کی طرف راغب کرنا تھا۔ مرزا مظہر نے دو مثبت اصلاحی اقدامات کیے۔ ایہام گوئی کو ختم کرنا اور ہندی اثرات کو اردو ادب میں غالب آنے سے روکنا۔ ان کی اس تحریک کا نتیجہ یہ نکلا کہ اردو اپنے ارتقاء کے ابتدائی مرحلے پر ہی فارسی زبان و ادب کے اسالیب و عناصر سے قریب ہوتی گئی اور اس کا رشتہ مسلمانوں کی ثقافتی اور تہذیبی قدروں کے ساتھ برقرار رہا۔

مرزا مظہر کی شاعری میں ان کے زمانے کے سیاسی حالات کی بہت موثر جھلک ہے۔ مسلمانوں کو جو مصائب درپیش تھے جن کی بدولت مسلمانوں کو مجبوری اور غلامی کا منہ دیکھنا پڑا اس کے احساس اور آزادی کی حسرت میں مظہر جان جاناں کا یہ شعر ان کے قلبی اضطراب کو بیان کرتا ہے۔

یہ حسرت رہ گئی کس کس مزے سے زندگی کرتے
اگر ہوتا چمن اپنا، گل اپنا، باغباں اپنا

چند شعر ملاحظہ ہوں۔

قفس کے بیچ بلبل کس قدر حسرت سے کہتی ہے
کہ پھر بھی دیکھنا قسمت میں ہوگا بوستاں اپنا
مرا جی جلتا ہے اس بلبل بے کس کی غربت پر
کہ گل کے آسرے پر جس نے چھوڑا آشیاں اپنا
جو تو نے کی سو دشمن بھی نہیں دشمن سے کرتا ہے
غلط تھا جانتے تھے تجھ کو جو ہم مہرباں اپنا [1]

سوداؔ کے چند شعر ملاحظہ ہوں

رلف کیا رکھے اس باغ کی سیر اے سوداؔ
شاخ پر دیکھنے دے گل کو نہ گلچیں جن دم
خندۂ گل بے نمک فریاد بلبل بے اثر
اس چمن سے آہ جا کر کیا کریں گے یاد ہم [2]

---

[1] "آب حیات" محمد حسین آزاد ص ۱۳۹

[2] "کلام سوداؔ" ڈاکٹر خورشید الاسلام ص ۲۹۴

میرؔ کا زمانہ غارت گری، اخلاقی پستی، بے اعتمادی اور شدید عدم یقینی حالات کا تھا۔ ان کی حساس طبیعت پر ان حالات نے جو ضرب لگائی میرؔ کا اس سے تڑپ اٹھنا یقینی تھا۔

کوئی نہیں جہاں میں جو اندوہ گیں نہیں
اس غم کدے میں آہ دل خوش کہیں نہیں [1]
تو ہے بے چارا گدا میرؔ تیرا کیا کہنا
مل گئے خاک میں یاں صاحب افسر کتنے [2]
شہاں کہ کل جواہر تھی خاک پا جن کی
انہی کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھیں
اب خرابا ہوا جہاں آباد
ورنہ ہر اک قدم پہ یاں گھر تھا

اس دور میں شہر آشوب کی شعری روایت کی داغ بیل پڑ چکی تھی۔ اس وقت کے شعراء نے عام سیاسی بے چینی اور معاشرتی بے قراری کے اظہار کے لیے شہر آشوب لکھے۔ یہ شہر آشوب اس کرب کو ظاہر

---

[1] [2] "دیوان اول" میر تقی میرؔ ص ۲۱۰ - ۳۵۳

کرتے ہیں جن سے شعراء دوچار تھے۔ یہ کرب بھی حب الوطنی کا ایک انداز تھا۔ اظہار محبت کے سانچے مختلف ہوتے ہیں جس سے محبت کی جاتی ہے اس کی صرف خوبیوں کو ظاہر کیا جاتا ہے۔ کبھی اگر وہ پریشانی میں مبتلا ہے تو اس سے خود کو ہم آہنگ کر کے اظہار محبت کے رخ پیدا کیے جاتے ہیں۔ ملک جس کرب سے گزر رہا تھا پورا شمالی ہند جس سیاسی بخار میں مبتلا تھا اس کی تپش ہمارے شعراء محسوس کر رہے تھے۔

یہاں مختلف شعراء کے شہر آشوب سے کچھ بند اس لیے نقل کیے گئے ہیں کہ اس کرب کا اندازہ ہو سکے۔

حاتم نے اپنے شہر آشوبوں میں اپنے عہد کی سیاسی، معاشی اور سماجی حالت پر تنقید کی ہے۔ ان کے دو شہر آشوب "بارہ صدی" کے عنوان سے ملتے ہیں۔ "بارہ صدی اول" کا بنیادی موضوع وہ سماجی انقلاب ہے جو نادر شاہ کے حملے سے وجود میں آیا تھا جس کے نتیجہ میں طبقاتی کشمکش اپنے عروج پر پہنچ چکی تھی اور اعلیٰ متوسط یا متوسط طبقہ کے افراد اپنی اقتصادی پریشانیوں کے ساتھ ادنیٰ طبقہ کی ترقی کو حسد کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے۔ اس کا دوسرا پہلو

یہ بھی ہے یہ حاتم نے جن پیشہ ور اقوام کے عروج کا نوحہ کہا ہے وہ بھی اس دور میں پریشاں حال اور پراگندہ روزگار پھر رہے تھے۔ حاتم کا تعلق اونچے طبقہ سے تھا اس لیے انھیں اس انقلاب کا زیادہ احساس تھا۔ اسی کے ساتھ ان کو حاکموں، امیروں، منصبداروں کی بداخلاقی اور بداعمالی کی شکایت بھی تھی۔ "بارہ صدی اول" کے چند بند یہ ہیں۔

سخوں کے بیچ عدالت کی کچھ نشانی نہیں
امیروں بیچ سپاہی کی قدردانی نہیں
بزرگوں بیچ کہیں بوئے مہربانی نہیں
توافع کھانے کی چاہو کہیں تو پانی نہیں
گویا جہاں سے جاتا رہا سخاوت و پیار

یہاں کے قاضی و مفتی ہوئے ہیں رشوت خور
یہاں کے دیکھ لو سب اہل کار ہیں گے چور
یہاں کرم سے نہیں دیکھتے ہیں اور کی اور
یہاں سبھوں نے بھلائی ہے دل سے موت اور گور
یہاں نہیں ہے مدار بغیر داد و مدار[1]

---

[1] "ہندوستاں ہمارا" اردو زبان کی قومی نظموں کا انتخاب مرتبہ جاں نثار اختر جلد دوم ص ۵۰

حاتم کا دوسرا شہر آشوب بھی انہی حالات پر مبنی ہے۔ بند ملاحظہ ہو۔

عجب یہ دور ہے شرفا کا کچھ نہیں روزگار
بہت عجیب قسم زندگی سے ہیں بیزار
ہزار عہدے پڑے پھرتے ہیں خدائی خوار
کہو تو کس طرح ہووے سپہ گری کا وقار
بہادرہائے غضب ہیجڑے کہاتے ہیں [1]

سودا کے دو شہر آشوب ملتے ہیں۔ ایک قصیدہ شہر آشوب دوسرا مخمس شہر آشوب۔ قصیدہ شہر آشوب میں سودا نے مجموعی طور پر بے روزگاری اور معاشی بدحالی کا ذکر کیا ہے۔

اتنا میں کیا عرض کہ فرمائیے حضرت
آرام سے سننے کی طرح کوئی بھی یاں ہے
سن کے یہ گلے کہنے کہ خاموش ہی رہ جا
اس امر میں تا حشر تو فرشتہ کی زباں ہے

---

[1] "ہندوستاں ہمارا" اردو زبان کی قومی نظموں کا انتخاب
مرتبہ جاں نثار اختر جلد دوم ص ۵۰

آرام سے کسنے کا سنا تو نے کچھ احوال
جمعیت خاطر کوئی صورت ہو کہاں ہے
دنیا میں تو آسودگی رکھتی ہے فقط نام
عقبیٰ میں یہ کہنا ہے کوئی اس کا نشاں ہے [1]

سودا کے دوسرے مخمس شہر آشوب میں دہلی کی تباہی، وہاں کے لوگوں کی بے روزگاری، امیروں کی پریشانی اور شرفا کی کسمپرسی کا تذکرہ ہے۔

قوی ہیں ملک میں مفسد امیر ہیں سو ضعیف
ٹکے کہاں جو ہمیں دے کے ہوں انھوں سے حریف
نہ کچھ ربیع میں حاصل نہ درمیان خریف
جو عامل اب ہیں محلات پر سو یوں ہیں ضعیف
کہ جس طرح کسی حاکم کے گھر گنوار ہو اول
خراب ہیں وہ عمارات کیا کہوں تجھ پاس
کہ جن کے دیکھے سے جاتی رہے تھی بھوک اور پیاس
اور اب جو دیکھو تو دل ہووے زندگی سے اداس

---

[1] "کلام سودا" ڈاکٹر خورشید الاسلام ص ۱۵۸ - ۱۱۲

کہ ئے گل چنوں میں کمر لد رہے گھاس
کہیں سنبل پڑا ہے کہیں پڑے مرغول
بنیب زادیوں کا ان دنوں ہے یہ معمول
وہ برقع سر پہ ہے جس کا قدم تلک ہے طول
ہے ایک گود میں لڑکا طلب کا سا بھول
اور ان کے حسن طلب کا ہر ایک سے یہ اصول
کہ خاک پاک کی تسبیح ہے جو لیجے مول
جہاں آباد تو کب اس ستم کے قابل تھا
مگر کسو کسی عاشق کا یہ نگر دل تھا
کہ یوں مٹا دیا گویا کہ نقش باطل تھا
عجب طرح کا یہ بحر جہاں میں ساحل تھا
کہ جس کی خاک سے لیتی تھی خلق موتی رول[1]

اپنے اظہار بیان کے اعتبار سے اس شہر آشوب کو وطن کا مرثیہ بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔

---

[1] "کلام سودا" ڈاکٹر خورشید الاسلام ص ۱۱۴ - ۱۱۵

میر کے کلیات میں باقاعدہ شہر آشوب نہیں ملتے لیکن چند مخمس شہر آشوب کے موضوعات پر مبنی ہیں۔ دو مخمسوں میں فوجی طور پر لشکر کی ہجو کی گئی ہے۔ ایک کا عنوان "در ہجو لشکر" اور دوسرے کا "در حال لشکر" ہے۔

جب کسی کو خدا کرے گمراہ　　آوے لشکر میں رکھ امید رفاہ
یاں نہ کوئی وزیر ہے نے شاہ　　جس کو دیکھو سو ہے بحال تباہ
طرفہ مردم ہوئے اکٹھے آہ
فوج میں جس کو دیکھو ہے اداس　　بھوک سے عقل گم نہیں ہیں حواس
بیچ کھایا ہے سب نے ساز و لباس　　چیتھڑوں بن نہیں کسی کے پاس
یعنی حافر براق ہیں گے سیاہ

"در حال لشکر" کے بند ملاحظہ ہوں

زندگانی ہوئی ہے سب پہ وبال　　کنجڑے پھینکیں ہیں روتے ہیں بقال
پوچھو مت کچھ سپاہیوں کا حال　　ایک تلوار بیچے ہے اک ڈھال
بادشاہ و وزیر سب قلاش
پیسے والے جو تھے ہوئے ہیں فقیر　　تن سے ظاہر گئیں ہیں جیسے لکیر
ہیں معذب غرض صغیر و کبیر　　مکھیاں سی گریں ہزاروں نفیر

دیکھ نظیر اُس پہ برابر ماس ۱۲

نظیر کے کلیات میں کئی مسدس اور مخمس شہر آشوب یا اس کی خصوصیات کے حامل ہیں۔ ایک طویل مخمس شہر آشوب کے عنوان سے ان کے کلام میں شامل ہے۔

ہے اب تو کچھ سخن کا مرے کاروبار بند
رہتی ہے طبع موج میں لیل و نہار بند
دریا سخن کی فکر کا ہے موج دار بند
ہر کس طرح نہ منہ میں زباں بار بار بند
جب آگرے کی خلق کا ہو روزگار بند

اب آگرے میں جتنے ہیں سب لوگ ہیں تباہ
آنا نظر کسی کا نہیں ایک دم نباہ
مانگو عزیزو ایسے برے وقت سے پناہ
وہ لوگ ایک کوڑی کے محتاج اب ہیں آہ
کسب و ہنر کے یاد ہیں جن کو ہزار بند

کیوں کر بھلا نہ مانگیے اس وقت سے پناہ
محتاج ہو جو پھرنے لگے دربدر سپاہ

یاں تک امیر زادے سپاہی ہوئے تباہ
جن کے جلو میں چلتے تھے ہاتھی و گھوڑے آہ
وہ دوڑتے ہیں اور کے پکڑے شکار بند

بے وارثی سے آگرہ ایسا ہوا تباہ
پھوٹی حویلیاں ہیں تو ٹوٹی شہر پناہ
ہوتا ہے باغباں سے ہر اک باغ کا نباہ
وہ باغ کس طرح نہ لٹے اور نہ اجڑے آہ
جس کا نہ باغباں ہو نہ مالی نہ خار بند

کیوں یار واں مکاں میں یہ کیسی چلی ہوا
جو مفلسی سے ہوش کسی کا نہیں بجا
جو ہے سو اس ہوا میں دوانہ سا ہو رہا
سودا ہوا مزاج زمانے کو یا خدا
تو ہے حلیم کھول دے اب اس کے چار بند

عاشق کہو اسیر کہو، آگرے کا ہے
ملا کہو، دبیر کہو، آگرے کا ہے
مفلس کہو، فقیر کہو، آگرے کا ہے

شاعر ہو، نظیر ہو، آگرے کا ہے

اس واسطے یہ اس نے کہے پانچ چار بند[1]

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ شہر آشوب میں سماج کی تباہی و بربادی کا جو نقشہ ہے وہ تاریخی صداقت پر مبنی ہے۔ جو خیالات پیش کیے گئے اس کی تائید ڈاکٹر اعجاز حسین کے مندرجہ ذیل اقتباس سے ہوتی ہے۔

"اس معرکے میں انھوں نے انسان دوستی اور حب الوطنی کا پورا ثبوت دیا نہ کسی بادشاہ سے ڈرے نہ کسی سرکش طبقہ سے..... وہی شعراء واقعات و انقلاب کے سماجی مورخ بن کر سامنے آئے اور معاشرے کی زبان بن کر شاعری کو غم کائنات کی سچی تصویر بنا دیا۔"[2]

اردو شاعروں نے دہلی کے زوال کو محض دیکھا ہی نہیں بلکہ وہ

[1] "انتخاب نظیر اکبر آبادی" رشید حسن خاں ص ۲۷

[2] "اردو شاعری کا سماجی پس منظر" ڈاکٹر اعجاز حسین ص ۲۲۷-۲۲۸

اس سے ماہر لبی ہوئے تھے۔ افغانوں، جاٹوں، سکھوں، مرہٹوں
انگریزوں کے حملوں میں انھوں نے دکھ اٹھائے اور صدمے برداشت
کیے وہ معاشی بدحالی کا شکار تھے۔ مصحفی کا یہ شعر بڑا معنی خیز ہے۔

کوڑی کوڑی بکتے ہیں گل کشور دہلی کے بیچ
حسن کے مالک جو تھے وہ ایسے ارزاں ہو گئے

مصحفی کے ایک قصیدے کے چند شعر دیکھیے۔

اطراف میں دلی کے یہ لکھ ماروں کا شور
جو آوے ہے باہر سے وہ اب شکستہ وہاں ہے
اب پڑتے ہیں راتوں کو جو نت شہر میں ڈاکے
باشندہ جو وہاں کا ہے بہ فریاد و فغاں ہے
اس شہر کا جس دن سے ہوا سندھیا حاکم
چوروں کی وہاں سیندھ سے اک گرگ گراں ہے
بیداد سے نائب کی یہ احوال ہے وہاں کا
ہر روز نیا قافلہ یوروب کو رواں ہے
ہر وقت تلنگے جو کھڑے رہتے ہیں ان سے
بس قلعہ کے نیچے ہی تک امن و اماں ہے

اس شہر کے باشندوں سے جا کر کوئی پوچھے
جز خون جگر کچھ بھی غذائے دل و جاں ہے

بت خانہ و مسجد میں جو پھیلی ہے خرابی
ناقوس کا نالہ نہ موذن کی اذاں ہے

گل جائے زباں میری کروں ہجو گراں کی
یہ تنگ معاشی کا سلاطین کے بیاں ہے

فاقوں کی زبوں مار ہے بیچاروں کے اوپر
جو ماہ کہ آتا ہے وہ ماہ رمضاں ہے

اے معنیؔ اس کا کروں مذکور کہاں تک
ہے صاف تو یہ گلشن دہلی میں خزاں ہے [1]

نادر شاہ کا حملہ دہلی کے لیے بلا بڑا اور سنگین حادثہ تھا اور پھر متواتر مرہٹوں، سکھوں، جاٹوں اور افغانوں کے حملے ہوتے رہے۔ ہر حملہ کے بعد اس کی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی اس صورت میں انتظام سلطنت کا درہم برہم ہونا۔ امن و امان کا مفقود ہونا اور اخلاقی ابتذال کا پیدا ہونا فطری امر تھا۔

---

[1] "ہندوستان ہمارا" مرتبہ جاں نثار اختر ص ۶۲

روزگار کا سکون نچلے طبقات تو درکنار طبقہ امراء کو بھی حاصل نہ تھا۔ اور جب ۱۸۵۳ء میں انگریزوں نے مغل حکمرانوں سے اقتدار چھین لیا تو ہندوستانیوں کے دلوں میں جذبہ آزادی اور جذبہ حب الوطنی قدر مشترک کی حیثیت سے پیدا ہوا۔ اس کے لیئے دہلی کو علامت کے طور پر استعمال کیا گیا۔ چناں چہ شاعروں نے اپنے ملک کی محبت کو دہلی سے منسوب کر دیا۔ اس دور کی شاعری میں یہی جذبہ مرقوم ہے۔ دہلی کی تباہی کا ذکر مختلف شعراء کے کلام میں مختلف انداز سے کیا گیا ہے۔ اور یہیں سے ایک نئے کرب سے ہمارے شعراء دوچار ہوتے ہیں یہ ہجرت کا کرب ہے۔ یعنی بہت سے شاعروں کا دلّی سے لکھنؤ آنا پڑا حیرت ہے کہ اس رخ کی طرف توجہ نہیں کی گئی کہ ہجرت کے بعد شعراء کو احساس اجنبیت کا شکار ہونا چاہیئے تھا لیکن جو لوگ دلی سے لکھنؤ گئے وہ یہ جانتے تھے کہ بہرحال وہ اپنے وطن میں ہیں۔ میں بالکل واضح الفاظ میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جو لوگ ہندوستان سے ترک وطن کر کے پاکستان گئے ان کی نسل کراچی یا لاہور سے اپنے کو ہم آہنگ نہیں کر سکی۔ جوش اپنے کو ملیح آبادی لکھتے رہے اور حفیظ خود کو

جالندھری۔ یہاں سے جانے والے شعراء اور نثر نگار وہاں پہنچ کر بھی
اپنے دیس کی محبوب گلیوں کی یاد کو یاد کرتے رہے۔ گھر کی اداس چوکھٹ
انھیں تڑپاتی رہی اور وہ جب بھی آئے تو انھوں نے یہاں کی خاک کو
اپنے سر کا تاج بنایا اور جب بھی گئے تو اس یاد کو اپنے ساتھ مذہب و
ایمان کی طرح لے گئے لیکن وہ شعراء جو دلی سے لکھنؤ آئے تھے یا جنھوں
نے حیدرآباد کی طرف مراجعت کی تھی ان لوگوں کو یہ احساس تھا کہ
نہ انھوں نے ترک وطن کیا ہے اور نہ ہی ہجرت کی ہے بلکہ اسے صرف
نقل مکانی کہا جا سکتا ہے۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان شعراء کو ہندوستانیت
کا سچا احساس تھا وہ یہ جانتے تھے کہ پورا ہندوستان اپنا ہے۔ وہ
اکبرآباد میں رہیں یا دلّی اور لکھنؤ میں وہ اپنے وطن ہی میں ہیں۔ البتہ
وہ علاقہ ان سے چھوٹ گیا ہے جہاں ان کے آبا و اجداد کی چوکھٹ
تھی۔ اس تناظر میں لکھنؤ کے شعراء کے کلام کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔

لکھنو نے اپنی تہذیب کی ارتقائی منزلیں آصف الدولہ اور سعادت علی خاں کے دور میں طے کیں۔ غازی الدین حیدر اور نصیر الدین حیدر کے دور تک لکھنو کی تہذیب اپنے عروج پر تھی۔ اس عرصہ میں دہلی کی سلطنت مغلیہ کے زوال کا تسلسل قائم تھا اس لیے شعرا کی اکثریت نے وہاں سے ہجرت کرنی شروع کی۔ بیشتر شعرا نے خوشحالی اور قربت کی وجہ سے لکھنو کو منتخب کیا۔

خان آرزو، سودا، میر، میر حسن، جرات انشا، مصحفی، رنگین، میر سوز مشہور ماہر شعرا ہیں۔ ان میں خان آرزو، سودا، میر دبستان دہلی کے نمایاں شاعر تھے جرات، انشا، اور رنگین کی شاعری کی ابتدا اگرچہ دہلی میں ہوئی مگر انھیں عروج لکھنو میں ہوا۔ ناسخ، آتش اور مصحفی نے تو یہاں ایک نئے دبستان کی بنیاد ڈالی۔ ان میں سے جو شعرا انقلابات زمانہ کے ہاتھوں مجبور ہو کر لکھنو میں آباد ہوئے۔ ان کے پیش نظر دہلی کی بربادی اور بدحالی کے تجربات تھے اور وہ جن شعری روایات کے حامل تھے ان میں داخلیت کا رجحان اور اس کے اسباب کی کسک زیادہ تھی چناں چہ ابتدا میں تو لکھنو میں دہلی کے دبستان کی روایات

محسوس ہوتی رہیں لیکن بعد میں خارجی زندگی کی دلکشی نے خصوصاً مہاجرات انشا اور رنگین جیسے نوجوان شعراء کو لبھانا شروع کیا۔

آصف الدولہ کے دور تک انگریزوں کی نظریں ادھر ہر طرح مرکوز ہو چکی تھیں اور انھوں نے اپنی چالبازیوں سے آصف الدولہ سعادت علی خاں، غازی الدین حیدر کو اپنی مرضی کا پابند بنالیا تھا۔ اس کے علاوہ غداری، درباری سازشیں، ریزیڈنسی سیاسی داؤ پیچ ایسے عوامل تھے جو اودھ کی سلطنت کو بھی رفتہ رفتہ انتشار، بدحالی اور زوال کی طرف لے جا رہے تھے۔ مہاجر شعراء پر اس تبدیل ہوتی ہوئی صورت حال کا ردعمل فطری تھا۔ اودھ کے حکمرانوں نے ان تباہ حال مہاجرین کی دل جمعی کی کوشش کی۔ ان کے لیے مشاہرے اور وظائف مقرر کیے گئے پھر بھی ان کے لیے یہاں کے ماحول میں مدغم ہو جانا آسان نظر نہیں آتا تھا۔ دبستان لکھنؤ کے ابتدائی ماحول کے جو تاثرات ردعمل کے طور پر مہاجر شعرائے دہلی کے قلب و ذہن میں پیدا ہوئے ان سے ان کی بے دلی و بے اطمینانی اور یہاں کی سیاسی اور سماجی زندگی کے چند پہلوؤں کا اظہار ہوتا ہے۔

ہوا آوارہ ہندوستاں جب سے　　قضا پورب میں لائی مجھ کو تب سے
جب آیا میں دیارِ لکھنؤ میں　　نہ دیکھا کچھ بہارِ لکھنؤ میں
زبس یہ ملک ہے بیہڑ پر بستا　　کہیں اونچا کہیں نیچا ہے رستہ
سوائے تودۂ خاک اور پانی　　یہاں ہر جنس کی دیکھی گرانی[1]

(میر حسن)

خرابہ دہلی کا وہ چند بہتر لکھنؤ سے تھا
وہیں اے کاش مر جاتا سراسیمہ نہ آتا یاں
برسوں سے لکھنؤ میں اقامت ہے مجھ کو لیک
یاں کے چلن سے رکھتا ہوں عزمِ سفر ہنوز
آباد اجڑا لکھنؤ چند دن سے اب ہوا
مشکل ہے اس خرابے میں آدم کی بود و باش[2]

(میر تقی میر)

مصحفی لکھنؤ میں دلی سے　　آیا طے کر کے راہ دور دراز
لیکن اس خاک میں ملی اس نے کہیں　　کچھ نہ دیکھا بجز نشیب و فراز[3]

---

[1] "لکھنؤ کا دبستانِ شاعری" ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی ص ۱۱۱-۱۱۲
[2] "لکھنؤ کا دبستانِ شاعری" ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی ص ۱۵۵
[3] "مصحفی حیات و کلام" افسر صدیقی امروہوی ص ۹۵

دہلی کے شعراء کے ہاں غور و فکر کے عناصر زیادہ ہیں اس لیے ان کی شاعری میں سیاسی اور سماجی ماحول کی ترجمانی کے ساتھ صورت حال کو بہتر بنانے کی خواہش کا اظہار بھی ملتا ہے۔ لکھنوی شعراء بھی کسی حد تک اپنے ماحول کے ترجمان ہیں لیکن ان کے کلام میں اس امر کا اظہار بھی ہے کہ وہ ایک قفس میں ہیں جو انھیں بڑا عزیز ہے وہ قفس سیلاب عشرت میں بہہ رہا ہے اور وہ بھی ایک بے بس تنکے کی طرح اس بہاؤ میں بہہ رہے ہیں۔ ان میں یہ احساس اودھ کے سیاسی حالات کے عین مطابق تھا۔ آئے دن انگریزوں کی ریشہ دوانیاں جیسے جیسے اودھ پر تسلط جما رہی تھیں اس نے دانشوروں کی نظروں میں آئینہ کی صورت حال واضح کر دی تھی۔ اس ماحول میں چند شعراء کے ہاں انقلاب زمانہ کی پیدا کردہ تلخیاں نظر آتی ہیں۔ حرارت نے اپنے انداز میں اس حالت پر بڑی معنی خیز روشنی ڈالی ہے۔

سمجھے نہ امیر ان کو کوئی نہ وزیر
انگریزوں کے ہاتھ اک قفس میں ہیں اسیر
جو کچھ وہ پڑھائیں سو یہ منہ سے بولیں
بنگالے کی مینا ہیں یہ یورپ کے امیر

۱؎ "لکھنؤ کا دبستان شاعری" ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ص ۱۷۲

شاعروں کو یہ احساس تھا کہ ہر عظیم کا حقیقی اقتدار انگریز کے ہاتھ میں چلا گیا ہے۔ ان کے پیش نظر وہ تاجر تھے جو تجارت کی غرض سے آکر ان پر حکومت کرنے لگے تھے۔ رسد و طلب کے سارے ذرائع پر اب ان کا تسلط تھا جس کے نتیجے میں یہاں کی معاشی حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ ملکی باشندوں کو ان کے اسباب کا احساس ہونے لگا تھا۔ مصحفی کے یہ شعر حقیقت کا اظہار ہیں۔

ہندوستاں کی دولت و حشمت جو کچھ کہ تھی ظالم فرنگیوں نے بتدبیر کھینچ لی
افسوس کہ چھینی ہے نصاریٰ کے لگوں نے یوں ہاتھ سے اس فرقہ اسلام کے دولی[1]

سیاسی طور پر عدم استحکام کی وجہ سے لکھنؤ آئے دن بے کاری، بے روزگاری، بھوک و افلاس کی آماجگاہ بنتا جا رہا تھا سلاطین و امراء کسی نہ کسی طرح اپنی وضع داری نباہ رہے تھے۔ اس قسم کے گھرانوں کی اقتصادی بدحالی اور بے زری کی کیفیت کو انشا نے اس طرح بیان کیا ہے۔

کہاں تک کروں میں زمانہ کا شکوہ مصیبت ہے یوں تو سب اہل ہنر پر
خصوصاً وہ جو وضعداروں میں ہیں یاں ہر ستاہی افلاس ہے ان کے در پر[2]

---

[1] "لکھنؤ کا دبستان شاعری" ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ص ۱۷۲
[2] "تذکرہ شعرائے اردو" مرتبہ ڈاکٹر اے وحید ص ۲۶۶

منشی سکوہ آبادی نے ایک مسلسل غزل میں اس عہد کی معاشی ناکامی کی ترجمانی کی ہے۔

ہندوستان بحر میں ہے ماتم معاش کا
جس گھر میں دیکھتا ہوں یہی ہائے ہائے ہے
کعبہ کو شیخ بیچے جو گاہک کوئی ملے
عید ہلال چشم برہمن میں گائے ہے
دعوت میں جو رئیس تکلف بہت کرے
پینے کو آب گرم ہے یا سرد چائے ہے
اندھیر ہے تغافل حکام عصر سے
گم کردہ راہ قافلۂ ہائے ہائے ہے [1]

بعض شعراء نے اس صورت حال کا ذمہ دار انگریزوں کو قرار دیا ہے۔

ہشیاری رنگ دیتی ہے قید فرنگ کا
دیوانگی فسانہ بناتی ہے سنگ کا
مہمان بہار باغ ہے دو چار روز کی

---

[1] "لکھنؤ کا دبستان شاعری"، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ص ۱۹۴

چھڑے ہے دور دورہ شراب فرنگ کا
تیار رہتی ہیں صف مژگاں کی پلٹنیں
رخسار یار ہے کہ جزیرہ فرنگ کا [1]

ایسے اشعار کے علاوہ جن میں واضح طور پر انگریزوں کا ذکر کیا گیا ہے کئی شاعروں کے کلام میں سیاسی ہیجانات پر مبنی خیالات ملتے ہیں جس سے شاعروں کے احساسات اور اس وقت کی صورت حال کا اندازہ ہوتا ہے۔

ہوائے دہر اگر انصاف پر آئی تو سن لینا
گل و بلبل چمن میں ہوں گے باہر باغباں ہوگا [2]
(آتش)

تہلکہ ہے جان کو ہر آن زیر آسمان
جلد نکلا چاہیے اس قصر بے بنیاد سے [3]
(ناسخ)

---

[1] "کلیات آتش" ص ۱۲۵
[2] "کلیات آتش" ص ۱۲۲
[3] "انتخاب ناسخ" تصحیح و ترتیب رشید حسن خاں ص ۱۴۰

رکھتا ہے جرخ اوج کسی کا کب ایک دن
ہوتا ہے دوپہر میں زوال آفتاب کا [1]

دل ملک انگریز میں جینے سے تنگ ہے
رہنا بدن میں روح کا قید فرنگ ہے [2]

(ناسخ)

گردوں پہ یہ شفق نہیں دیکھا تو مصحفی
خون شہاں سے سرخ ہے رنگ اس نباط کا [3]

ہیں مصحفی ہم اب تو پابند حادثے کے
دیکھیں ٹلے ہے کس دن سر سے بلائے عالم [4]

اس طرح لکھنو میں جب پہلی جیسی صورت حال اور رونق نہ رہی تو شعراء جو اپنی جذباتی فطرت کی وجہ سے اس سے لگاؤ اور انس رکھتے تھے۔ اس کی تباہی اور ویرانی پر خاموش نہ رہ سکے ان

---

[1] "انتخاب ناسخ"، تصحیح و ترتیب رشید حسن خاں ص ۲۱۵

[2] "دیوان ناسخ"، حصہ دوم ص ۲۲۲

[3] "کلیات مصحفی" (حصہ اول) بہ تصحیح نثار احمد فاروقی ص ۶۱

[4] "کلیات مصحفی" (حصہ اول) بہ تصحیح نثار احمد فاروقی ص ۲۱۱

کے کلام میں اپنے وطن سے اُنسیت، فراق اور محبت کے جذبات کا جابجا اظہار ہے۔

۱۸۵۷ء میں واجد علی شاہ معزول کر دیئے گئے بیشتر افراد جو اودھ کی حکومت سے توسل رکھتے تھے بیروزگار اور بے وطن ہو گئے۔ شہر بربادی اور ویرانی کی تصویر بن گیا۔ واجد علی شاہ کے کلام میں ان کیفیات کا بیان ملتا ہے۔

ہائے وطن دیکھوں تو شاداں ہو دل زار مرا
یہ بھی ممکن ہے کہ رونے کو ہنسائے غربت
وسعت خلد سے بڑھ کر ہے یہیں حب وطن
تنگیٔ گور سے بدتر ہے فضائے غربت [1]

شب اندوہ میں رو رو کے بسر کرتے ہیں
دن کو کس رنج و تردد میں گزر کرتے ہیں
نالہ و آہ غرض آٹھ پہر کرتے ہیں
در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
رخصت اے اہل وطن! ہم تو سفر کرتے ہیں

---

[1] "لکھنؤ کا دبستان شاعری" ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ص ۲۷

ریخ جو ہے اسے اب اے دل پر درد اٹھا
تعزیہ خانوں تلک کا مرا اسباب لٹا
فصل گریہ میں تاسف! مرا گھر تک ہے چھٹا
در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
رخصت اے اہل وطن! ہم تو سفر کرتے ہیں

سارے اب شہر سے ہوتا ہے یہ اختر رخصت
آگئے بس اب یہیں کہنے کی ہے مجھ کو فرصت
ہو نہ برباد مرے ملک کی یارب خلقت
در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
رخصت اے اہل وطن! ہم تو سفر کرتے ہیں

پچھلے صفحات پر اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ سرسری طور پر سہی حب الوطنی کے جذبات سے معمور کچھ ایسے نمونے پیش کر دیئے جائیں جن سے اردو شاعری ہمیشہ مالا مال رہے گی۔ اردو چونکہ مشترکہ تہذیب کی میراث ہے اس لیئے اس میں حب الوطنی کے جذبات کا ہونا کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ صرف یہ ظاہر کرنا مقصود

۱؎ "اردو میں قومی شاعری کے سو سال" مرتب علی جواد زیدی ص ۱۴۷

ہے۔ بیجاپور کے شاعر ہوں یا لکھنؤ کے، دلّی کے شاعر ہوں یا لکھنؤ کے یا اودھ کے۔ ان سب کے ہاں وطن سے محبت کا جذبہ موجود ہے۔ قطب شاہی بادشاہوں اور مغل شہنشاہوں کو اگر کوئی، غیر ملکی حکمران کہتا ہے تو اس سے بڑی دروغ گوئی اور کچھ نہیں ہو سکتی۔ غیر ملکی حکمران تو وہ تھے جو یہاں آئے، اس زمین کو لوٹا، یہاں کی دولت اپنے ملک بھیجتے رہے اور اپنے ہاں کی مصنوعات کو کامیاب کرنے کے لیے یہاں کی مصنوعات کا گلا گھونٹ دیا۔ انگریز، پرتگیزی، پرتگالی، فرانسیسی سب اسی زمرے میں آتے ہیں۔ لیکن مسلمان بادشاہ تو یہاں کی مٹی کا جزو لاینفک بن گئے تھے جس کا ثبوت ان کی شاعری ہے۔ جس کا ثبوت ہندوستان کی وہ تہذیبی میراث ہے جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول سے وجود میں آئی۔ جہاں آب گنگا اور چاہ زم زم دونوں کو یکساں طور پر درجہ تقدس حاصل تھا، جہاں کاشی اور کعبہ یا کیرتی کی دو علامتیں تھیں، جہاں شیخ و برہمن ایک جان دو قالب تھے۔

تیسرا باب

۱۸۵۷ء سے ۱۹۰۰ء تک ملک کی مختلف تحریکات اور ان کے اثرات

۲۷ / مئی ۱۴۹۸ء کو جب واسکو ڈی گاما کالی
کٹ کی بندرگاہ پہنچا تب سے ہندوستان میں مغربی اقوام کی آمد کا
سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ ۱۵۱۰ء میں البوقرق نے پرتگالی سلطنت
کے لیے گوا کا بندرگاہ حاصل کیا لیکن ان کا اثر ہندوستانی تجارت پر
اٹھارویں صدی میں ہی ختم ہو گیا۔ ۱۶۰۵ء میں ڈچ تجارتی
مفاد کے لیے ہندوستان آئے انھوں نے سورت، چنسورہ،
قاسم بازار، بادہ نگر، پٹنہ، کوچین وغیرہ میں اپنی فیکٹریاں
قائم کیں۔ ۱۶۶۷ء میں فرانسیسی بھی سورت میں اپنی فیکٹری
قائم کر چکے تھے۔ ابتداء میں تجارت تک محدود رہے لیکن ۱۷۴۲ء
سے انھیں بھی سیاست سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ کرناٹک کی لڑائی میں
ڈوپلے کی سیاست آخر میں ان کی شکست کا سبب بنی۔ اور واٹرلو
کی لڑائی میں انگریزوں سے شکست کے بعد ملکی سیاست سے
ان کا خاتمہ ہو گیا۔ انگریزوں کی آمد کا سلسلہ ۱۶۰۹ء سے شروع
ہوتا ہے جب ہاکنس ہندوستان میں جہانگیر کے دربار میں آیا۔
۱۶۱۳ء میں جہانگیر نے سورت میں مستقل ایک فیکٹری بنانے

لی انھیں اجازت دے دی۔ ۱۶۱۹ء میں سورت، آگرہ اور برہانپور میں ان کی فیکٹریاں قائم ہو چکی تھیں۔ مسولی پٹم میں وہ پہلے ہی اپنی فیکٹری قائم کر چکے تھے۔

انگریز جو یہاں تجارت کی غرض سے آئے تھے لیکن ان کی نیت ٹھیک نہیں تھی اس کا اندازہ اس خط سے لگایا جا سکتا ہے جو سورت اور بمبئی کے گورنر نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹر کو لکھا تھا۔ وہ لکھتا ہے

"وقت کا تقاضا ہے کہ تجارتی معاملات
کی درستگی کے لیئے آپ کے ایک ہاتھ میں
تلوار بھی ہو۔" [1]

لیکن اس بدنیتی کے باوجود بھی انھیں مغل بادشاہوں سے مراعات ملتی رہیں اور ۱۷۱۵ء میں ہملٹن نے جان سرمن۔ اسٹیفنسن اور خواجہ سرہود (مترجم) کے ہمراہ دلی کا سفر کیا۔ ہملٹن فرخ سیر کے کامیاب معالجہ کے بعد بادشاہ سے بنگال میں بغیر محصول کے تجارت کرنے کے فرمان کی توثیق حاصل کرنے میں

---

[1] بحوالہ "اردو شاعری میں قومی یکجہتی کے عناصر" ڈاکٹر مجاور حسین ص ۲۸۱

کامیاب ہو گیا اور صوبوں میں بھی اسی طرح کی مراعات ملیں۔
انگریزوں نے باقاعدہ طور پر ۱۷۴۳ء سے کرناٹک کی لڑائی میں
حصہ لینا شروع کیا اور فرانسیسیوں کو شکست دے کر اپنا دھاک
جمالی اور پھر ۲۳ر جون ۱۷۵۷ء کی لڑائی میں سراج الدولہ
کی شکست اور ۲۲ر اکتوبر ۱۷۶۴ء کو بکسر میں شاہ عالم
شجاع الدولہ اور میر قاسم کی متحدہ افواج کی شکست کے بعد
ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان میں ایک اہم سیاسی طاقت بن گئی۔
انگریزوں نے مقامی جاگیرداروں کو پہلے
آپس میں لڑا کر کمزور بنایا پھر ان سے اقتدار چھیننا شروع
کر دیا۔ لارڈ ڈلہوزی نے مستبنیٰ کرنے کے رواج کو ختم کر کے
ریاستوں کے الحاق کی پالیسی اپنائی۔ اس وقت کے حالات کے
بارے میں کارل مارکس نے لکھا

"انگلینڈ نے ہندوستان کے سماجی نظام
کو درہم برہم کر کے رکھ دیا ہے۔ ہندوستان
اپنی پرانی دنیا تو کھو چکا ہے لیکن اسے نئی
دنیا نہیں مل پائی..... برطانیہ کی

غلامی میں آکر موجودہ ہندوستان
اپنی ماضی کی تاریخ اور روایات سے
ناتا ہی توڑ چکا ہے۔" [1]

سماجی نظام کے اس طرح درہم برہم ہو جانے کے اقتصادی اسباب بھی تھے۔ لوٹ کھسوٹ کا ایک سلسلہ تھا۔ عبداللہ یوسف علی ان عوامل پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں

"کمپنی کے نوکروں نے لوگوں کو اپنی
حرص و طمع کا شکار بنا رکھا تھا۔ اس
زمانے میں ہندوستان کے امراء اور سپاہی
زمیندار اور رعیت، عالم و صناع
سب مصیبت و پریشانی میں مبتلا
تھے[2] انگریزی فیشن پھیل رہا تھا۔
معاشرتی و سیاسی اصلاح مہیب و
خطرناک نظر آنے لگی[3] عوام کی نظریں

---

[1] Karl Marx & Fredrick Engles:
Selected Works Vol One P 489

انگریز ملازمین کی طرف اٹھنے لگی تھیں

..... معمولی انگریز حجام لاکھوں

کما کر لے جاتا تھا۔[1] ۱۸۱۹ء کے بعد دس

لاکھ سے زیادہ آدمی جو فوج میں تھے

یا اس سے متعلق تھے بیکار ہو گئے تھے۔" [2]

یہ وہ اسباب تھے جو اندر ہی اندر فضاء کو مکدر کر رہے تھے اور لاوا پھٹنے کو تیار تھا۔ قیادت جنرل بخت خاں، تانتیا ٹوپے، عظیم اللہ خاں، نانا صاحب، رانی لکشمی بائی اور حضرت محل کے ہاتھ میں تھی۔ اس لڑائی میں ہندوستان کو شکست ہوئی۔ بہادر شاہ ظفر رنگون بھیجے گئے۔ واجد علی شاہ اختر صیابرج میں قید ہوئے۔ منیر شکوہ آبادی کو کالے پانی کی سزا ہوئی۔ صہبائی کو شہید کیا گیا۔

اردو شعراء نے ۱۸۵۷ء کے کرب کو

محسوس کیا اور تقریباً ہر قابل ذکر شاعر نے اپنے اس درد کا

---

[1] "انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ" عبداللہ یوسف علی

ص ۵۸، ۲۱۱، ۲۱۳، ۲۲۸

اسی مہم میں نہج سے اظہار کیا ہے۔

واجد علی شاہ اختر کی مثنوی حزن اختر میں ان کی قید کے حالات ملتے ہیں۔ اس کے منتخب اشعار ملاحظہ ہوں۔

رجب کی ہوئی پانچویں جبکہ یار　　شب پنجشنبہ ہوئی آشکار
کیا بندے نے لکھنو سے سفر　　لیا ساتھ تھوڑا سا کچھ ماحضر

اپنے ہم وطنوں سے محبت کا اندازہ اس دعا سے لگایا جا سکتا ہے

دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتا ہوں میں　　دو اشک دو کر بہاتا ہوں میں
مری آبرو رکھ خدائے کریم　　بہت اپنے بندوں پہ ہے تو رحیم
الٰہی رہیں شاد یاران ہند　　بھر آباد ہو ویں جوانان ہند[1]

واجد علی شاہ اختر کی مثنوی کے ساتھ آغا حجو شرف کی ایک مثنوی "افسانۂ لکھنو" بھی ملتی ہے جس میں منقبت کے اشعار میں حضرت علیؑ سے دعا کی گئی ہے۔

مدد کیجیے لکھنؤ لٹ گیا　　خبر لیجیے لکھنؤ لٹ گیا
لے آؤ واجد علی شاہ کو　　بٹھا جاؤ واجد علی شاہ کو

---

[1] "اردو میں قومی شاعری کے سو سال" مرتبہ علی جواد زیدی ص ۶۸، ۳۷

حساب میں لے لو ولیعہد کو ولیعہدی سپرد ولیعہد کو

خداوند بہر خدائے قدیر عنایت ہو پھر ان کو تاج و سریر [1]

اسی طرح ایک مثنوی "رشک ماہ تمام" نواب محمد رضا خاں عاشق کی ملتی ہے۔ اس میں واجد علی شاہ کی معزولی، ان کا سفر کلکتہ، مٹیا برج میں نظر بندی، فورٹ ولیم میں ان کے قید کیے جانے اور اس انقلاب میں لکھنو جن مصائب و آلام کا گہوارا بنا اس کا ذکر ہے۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ عوام کے دلوں میں بادشاہ کی کتنی محبت تھی اور لکھنو کا کیا حال تھا۔

اس مثنوی سے چند منتخب اشعار ملاحظہ ہوں۔

کہاں ہیں وہ جلسے کہاں ہیں وہ رنگ
مئے عیش و راحت کے جتنے تھے دھنگ

کہاں ہے وہ سلطاں کہاں ہے وہ فوج
نہیں لکھنو کا وہ باقی اب اوج

سواروں کی "لیس" ہوئیں سب اجاڑ
گرا آسماں ان پہ، لوٹا پہاڑ

---

[1] "اردو میں قومی شاعری کے سو سال" مرتبہ علی جواد زیدی ص ۸۵

عجب غم سے تھا جان عالم کا حال
کرے رحم ان پر مرا ذوالجلال
لگے بڑھنے سنبل کی صورت سے بال
الجھتا ہوا ان کا دل پر وبال
ہوا زرد رخ مثل برگ خزاں
نہ تھا سبزہ خط تھے کبودی نشاں
تپ غم سے ایسا ہوا جسم زار
نظر آتا تھا نظروں میں مانند تار
نقاہت سے سر تھا اٹھانا محال
ہوا بوجھ دل پر تھا بار خیال
دو آنکھیں جو نرگس سے تھیں خوب تر
رواں ان سے آنسو تھے دو دو پہر
کسی کا مقدر ہو ایسا نہ بد
نہیں "جان عالم" کے صدموں کی حد [1]

---

[1] "اردو میں قومی شاعری کے سو سال" مرتبہ علی جواد زیدی ص ۸۴

۱۸ ستمبر ۱۸۵۷ء کو شہر دہلی انگریزوں کے
قبضہ میں آگیا۔ بہادر شاہ ظفر کو قید کر کے ان پر مقدمہ چلایا اور
شہزادوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ سلطنت کی بربادی
کا غم ان کے لیئے ذاتی غم تو تھا ہی ان کے کلام میں عوام کے دل کی
دھڑکنیں بھی صاف سنائی دیتی ہیں۔ وطن عزیز کو خیرباد کہتے ہوئے
قومی غم کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔

گئی یک بیک جو ہوا پلٹ نہیں دل کو میرے قرار ہے
کروں اس ستم کا میں کیا بیاں مرا غم سے سینہ فگار ہے
یہ رعایا ہند تباہ ہوئی، کہوں ان پہ کیا کیا جفا ہوئی
جسے دیکھ حاکم وقت نے کہا یہ بھی قابل دار ہے
یہ کسی نے ظلم بھی ہے سنا کہ دی پھانسی لوگوں کو بے گنہ
ولے کلمہ گویوں کی سمت سے ابھی ان کے دل میں غبار ہے
نہ تھا شہر دہلی، یہ تھا اک چمن کہوں کس طرح کا تھا یاں امن
جو خطاب تھا وہ مٹا دیا فقط اب تو اجڑا دیار ہے
یہی تنگ حال جو سب کا ہے، یہ کرشمہ قدرت رب کا ہے
جو بہار تھی سو خزاں ہوئی جو خزاں تھی اب وہ بہار ہے

شب و روز پھول میں جو تلے، کہو خارِ غم کو وہ کیا ہے
ملے طوق قید میں جب انھیں، کہا گل کے بدلے یہ ہار ہے
سبھی باوہ ماتم سخت ہے، کہو کیسی گردش بخت ہے
نہ وہ تاج ہے نہ وہ تخت ہے، نہ وہ شاہ ہے نہ دیار ہے
جو سلوک کرتے تھے اور سے، اب ہیں دیکھو وہ کس طرح سے
وہ ہیں تنگ چرخ کے جور سے، دہاتن پہ ان کے نہ تار ہے [1]

انگریزوں کے انسانیت سوز مظالم برداشت کرتے ہوئے جب وہ رنگون پہنچے تو انھوں نے ایک دردناک صدا سنی۔

بالعکس ہیں زمانے میں جتنے ہیں کاروبار
شیوہ کیا ہے الٹا زمانے نے اختیار
ہے موسم بہار خزاں اور خزاں بہار
آئی نظر عجب روش باغ روزگار
جو نخل پر ثمر ہیں اٹھا سکتے سر نہیں
سرکش ہیں وہ درخت کہ جن میں ثمر نہیں
باد صبا اڑاتی چمن میں ہے سر پہ خاک

---

[1] "نوائے وطن" مرتبہ خلیل الرحمٰن اعظمی ص ۲۱۳ - ۲۱۴

ملتے ہیں سر بہ سر کف افسوس برگ تاک
غنچے ہیں دل گرفتہ گلوں کے جگر ہیں چاک
کرتی ہیں بلبلیں بھی فریاد دردناک

شاداب حیف خار ہوں گل پائمال ہوں
گلشن ہوں خار نخل معیلاں نہال ہوں

جائیں نکل ملک کے اطلے سے ہم کہاں
ہووے گا سر پہ چرخ بھی جائیں گے ہم جہاں
کوئی بلا ہے خانہ زنداں سے آسماں

جھٹکا وال اس سے ہے جب تک ہے تن میں جاں

جو آگیا ہے اس محل تیرہ رنگ میں
قید حیات سے ہے وہ قید فرنگ میں [1]

اس دور میں شہر آشوب زیادہ لکھے گئے۔ اس عظیم انقلاب نے اردو شاعری کو بہت متاثر کیا۔ بیشتر شعراء نے آزادی کی اس جنگ میں عملی طور پر حصہ لیا۔ ہندوستان میں اس وقت ادب اور کلچر کے دو بڑے مراکز دہلی اور لکھنؤ تھے۔ انگریزوں

---

[1] "قومی شاعری کے سو سال" مرتبہ علی جواد زیدی ص ۷۶

بے انتظام کا طوفان کئی نایاب چیزوں کے ساتھ ان درباروں کی ادبی رنگینیوں کو بھی تباہ کر گیا اس کا اثر پورے معاشرے پر پڑا۔ اردو شعراء کے کلام میں قومی وحدت کا مرکز دہلی سے محبت کی شکل میں نمودار ہوا۔ انھوں نے اس کے ایک ایک کھنڈر پر خون کے آنسو بہائے۔ اس دور کے حالات پر جو مشہور شہر آشوب لکھے گئے ان میں مرزا قربان علی سالکؔ، محمد علی تشنہؔ، ظہیر دہلوی حکیم محمد حسن خاں محسنؔ قابل ذکر ہیں۔

محمد علی تشنہؔ کا "دار و رسن" کے نام سے مسدس ملاحظہ ہو۔

عجیب لوچہ رشک جناں تھا دہلی کا
بہشت کہتے ہیں جس کو مکاں تھا دہلی کا
دماغ ہر سر ہفت آسماں تھا دہلی کا
خطاب خطۂ ہندوستاں تھا دہلی کا

غضب ہے اس کو کوئی شادماں نہ دیکھ سکا
زمیں نہ دیکھ سکی، آسماں نہ دیکھ سکا

وہ تخت سلطنت و بارگاہ سلطانی
کہ جس میں بیٹھتے تھے آکے ظلّ سبحانی

پروں سے سر پہ ہما کرتا تھا مگس رانی
بجا اس اوج پہ تھا دعوئے سلیمانی
ہر اک قصر کو دعویٰ تھا طاق کسریٰ کا
دماغ عرش پہ تھا قلعہ معلیٰ کا
زحل کی آنکھ پڑی اتفاق سے ناگاہ
تمام ہو گیا تاراج ملک و مال اور جاہ
کہ اس سے ہو گئے بدتر غریب شاہنشاہ
رعیت اس کی ہوئی اس سے بھی زیادہ تباہ
وہ ساہوکار نہ تھا جس کی ساکھ میں بٹا
اب اس کے نام پہ لگتا ہے لاکھ میں بٹا[1]

شاعروں کے دل میں دہلی (وطن) کی محبت کا جذبہ بڑی شدت سے موجود ہے۔ شہزاد نے دہلی کے تعلق سے اپنے جذبات کو مختلف کیفیات، علامات اور اشارات میں بیان کیا ہے۔ مرزا قربان علی بیگ سالک کا شہر آشوب "انقلاب دہلی" سے چند اقتباسات پیش ہیں۔

---

[1] "فغان دہلی" مرتبہ تفضل حسین کوکب ص ۵۴-۵۵

یہ انقلاب ہے یا ہے قیامت صغرا
کوئی نہیں ہے کہ جس کے رہے ہوں ہوش بجا
ہوئی ہے آدمی کی شکل شہر میں عنقا
بنا ہے ہو کا مکاں ہیں ہر اک گلی کوچا
ہوئے ہیں لوگ یہاں کے کہاں کہاں آباد
ہر ایک گاؤں بنا ہے مگر جہاں آباد
کسی کے لب پہ ہے نالہ کسی کی چشم ہے تر
کسی کا چاک گریباں ہے اور کوئی مفطر
کسی کا ہاتھ ہے دل پر کوئی ہے تھامے جگر
غرض کہ درج سے خالی نہیں ہے کوئی بشر
بجائے زمزمہ ہر جائے شیون غم ہے
محل عیش تھا یا اب سرائے ماتم ہے
سمجھ کے اپنا ٹھکانہ گئے جہاں ہم لوگ
ذلیل یاں سے زیادہ ہوئے وہاں ہم لوگ
بنے ہیں طائر گم گشتہ آشیاں ہم لوگ
پھرے ہیں امن کے طالب کہاں کہاں ہم لوگ

زمین ہوگئی دشمن نہ پائی جائے ثبات
ٹھہر سکا نہ کہیں جائے اپنا پائے ثبات

وہ لوگ کھاتے تھے جن کی نشاط کی قسمیں
پڑے ہیں طالع ناسازگار کے بس میں
محل میں رہتے تھے یا اب پڑے ہیں محبس میں
نہ تاب دل میں ہے، طاقت نہ جان بیکس میں

جو تشنہ لب ہوں تو آب دم سناں موجود
جو گرسنہ ہوں تو کھانے کو گولیاں موجود[1]

حکیم محسن خاں محسنؔ کا "نوحہ دہلی" ملاحظہ ہو

بے نشاں ہوگیا عالم میں نشان دہلی
لامکاں بن گیا ایک ایک مکان دہلی
نامہ بر کوچہ، نہ بازار و محلہ باقی
خط پہ کیا خاک لکھوں نام و نشان دہلی
گھر کھدا، مال لٹا، جان گئی اشک بہے
ہیں مصیبت میں مصیبت زدگان دہلی

---

[1] "فغان دہلی" مرتبہ تفضل حسین کوکب ص ۱۷

وا رہیں آنکھیں پس قتل بھی مقتولوں کی
تن بے جاں تھے مگر تھے نگران دہلی [1]

ظہیر دہلوی کی حب الوطنی "داستان انقلاب" میں ملاحظہ ہو

مواد ہند میں عرش احتشام تھی دہلی
بیاض مردمک خاص و عام تھی دہلی
زمین چرخ کی قائم مقام تھی دہلی
جب آیا عہد جوانی تمام تھی دہلی

یہ وہ زمیں ہے زمیں جس کی زر اگلتی ہے
یہ خاک وہ ہے کہ اکسیر ہاتھ ملتی ہے

جہاں آباد لقب تھا یہ عز و شاں کے لیئے
جہاں کا لفظ بنا تھا اسی مکاں کے لیئے
یہ درجے اس کے لیئے تھے نہ آسماں کے لیئے
کہ اس سے کام زمانے نے دو جہاں کے لیئے

فلک سے رتبہ میں رتبہ دوچند تھا اس کا
مقام عرش سے پایہ بلند تھا اس کا

---

[1] "فغان دہلی" مرتبہ تفضل حسین کوکب ص ۱۳۷

یہ شہر وہ ہے کہ غنچہ تھا حسن والوں کا
یہ شہر وہ ہے کہ تختہ تھا نونہالوں کا
یہ شہر وہ ہے کہ مجمع تھا ماہ جمالوں کا
یہ شہر وہ ہے کہ مرجع تھا ذی کمالوں کا
یہ وہ مکاں ہے مکیں جس کے فقر و جم تھے
یہ خطہ وہ ہے گدا جس کے فخر حاتم تھے

نکلتے شہر سے ہیں پر نکل نہیں سکتے
ہزار چال سے چلتے ہیں چل نہیں سکتے
کروڑ شکل کو بدلیں بدل نہیں سکتے
قدم قدم پہ ہے لغزش سنبھل نہیں سکتے
کمند موت نے کیا بند بند جکڑے ہیں
زمین شہر نے ایک ایک کے پاؤں پکڑے ہیں

ہر ایک شہر کا پیر اور جواں قتل ہوا
ہر ایک قبیلہ و ہر اک خاندان قتل ہوا
ہر ایک اہل زباں خوش بیاں قتل ہوا
غرض خلاصہ یہ ہے اک جہاں قتل ہوا

گھروں سے کھینچ کے کشتوں پہ کشتے ڈالے ہیں
نہ گور ہے نہ کفن ہے نہ رونے والے ہیں[1]

دہلی کی تباہی پر داغ دہلوی نے "مرثیہ دہلی" لکھا

فلک زمین و ملائک جناب تھی دہلی
بہشت و خلد میں بھی انتخاب تھی دہلی
جواب کاہے کو تھا لاجواب تھی دہلی
مگر خیال سے دیکھا تو خواب تھی دہلی

پڑی ہیں آنکھیں وہاں جو جگہ تھی نرگس کی
خبر نہیں کہ اسے کھا گئی نظر کس کی

فلک نے قہر و غضب تاک کر دکھایا
تمام پردۂ ناموس چاک کر دکھایا
لپیٹ ایک جہاں کو ہلاک کر دکھایا
غرض کہ لاکھ کا گھر اس نے خاک کر دکھایا

جلی ہیں دھوپ میں شمعیں جو ماہتاب کی تھیں
کھنچی ہیں کانٹوں پہ جو پتیاں گلاب کی تھیں

---

[1] "فغان دہلی" مرتبہ تفضل حسین کوکب ص ۹۱ - ۹۲

لہو کے چشمے ہیں چشم تر آب کی صورت
شکستہ کاسہ سر ہیں حباب کی صورت
لیئے ہیں گھر دل خانہ خراب کی صورت
کہاں یہ حشر میں لوتہ عذاب کی صورت

زبان تیغ سے پرسش ہے دادخواہوں کی
رسن ہے، طوق ہے، گردن ہے بے گناہوں کی

ہر رنگ بوئے گل اہل چمن چمن سے چلے
غریب چھوڑ کے اپنا وطن وطن سے چلے
نہ پوچھ زندوں کو بے چارے کس چلن سے چلے
قیامت آئی کہ مردے بھی کفن سے چلے

تمام امن جو ڈھونڈا تو راہ بھی نہ ملی
یہ قہر تھا کہ خدا کی پناہ بھی نہ ملی [1]

حکیم آغا جان عیش دہلی اور لکھنؤ کی خانماں بربادی کا نقشہ بڑے دردناک پیرائے میں پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ دہلی اور بہار لکھنؤ سب ایک داستان پارینہ بن کر رہ گئے ہیں۔ لکھنؤ کی وفعداری

---

[1] "فغان دہلی" مرتبہ تفضل حسین کوکب ص ۶۱ - ۶۲

و تلفات اور نقش و نگار بھی محض خواب و خیال معلوم ہوتے ہیں۔ گھنٹہ رات کا ذرہ ذرہ ان کا ماتم کناں ہے۔

ہو گئے ویران دہلی و دیار لکھنو
اب کہاں وہ رونق دہلی و بہار لکھنو
باغ دہلی تو ہوا یوں یک قلم برباد اور
مل گیا سب خاک میں نقش و نگار لکھنو
اہل جوہر تو ملائے خاک میں دہلی نے واں
رہ گئے یوں بے سر و پا و فعدار لکھنو
قاضی و خاشاک دہلی غیرت صد لالہ زار
رشک صد گلزار تھا ایک ایک خار لکھنو
سو ملک نے یوں کیا دہلی کو تو پامال جور
اور کیا وقف جفا ہر برگ و بار لکھنو
غم میں دہلی کے گلوں کے تو گریباں چاک ہیں
اور سوسن ہے چمن میں سوگوار لکھنو
ٹکڑے ہوتا ہے جگر دہلی کے صدمے سن کے عیش
اور دل پھٹتا ہے سن کر حال زار لکھنو [1]

---

[1] "ہندوستان ہمارا" مرتبہ جاں نثار اختر ص ۹۱

مرزا غالب نے اگرچہ اپنے عہد کی سیاسی سرگرمیوں میں عملی طور پر کوئی حصہ نہیں لیا تاہم دہلی پر نازل ہونے والے عتاب کا آنکھوں دیکھا حال ان کی شاعری میں نمایاں ہے۔ ۱۸۵۷ء کی قیامت خیزی پر ایک قطعہ ملاحظہ ہو۔

بسکہ فعال ما یرید ہے آج — ہو سلح شور اگستاں کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے — زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے — گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر دلی کا ذرہ ذرہ خاک — تشنہ خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک — آدمی واں نہ جا سکے یاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا — وہی رونا تن و دل و جاں کا
گاہ جل کر کیا کیے شکوہ — سوزش داغ ہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کیے باہم — ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا

اس طرح کے وصال سے یارب
کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا [1]

---

[1] "دیوان غالب" حمیدیہ (المعروف بہ نسخہ حمیدیہ) مرتبہ مفتی محمد انوار الحق ص ۱۸۴

مہر مہدی مجروح کے دو شہر آشوب ملتے ہیں جو غزل کی ہیئت میں ہیں ایک شہر آشوب میں ۱۸۵۷ء میں دلی کی تباہی کا نقشہ اس طرح پیش کیا گیا ہے۔

حرف تم اپنی نزاکت پہ نہ لانا ہرگز
ہاتھ بیداد ستم سے نہ اٹھانا ہرگز
ذکر بربادی دہلی کا سنا کر ہمدم
نیشتر زخم کہن پر نہ لگانا ہرگز
وہ تو باقی ہی نہیں جن سے کہ دہلی تھی مراد
دھوکہ اب نام پہ دہلی کے نہ کھانا ہرگز [1]

دوسرے شہر آشوب میں مجروح نے دلی کی عظمت اور یہاں کے باکمالوں کو اس طرح خراج تحسین پیش کیا ہے۔

مہر زر خاک کو کرتا ہے یہ ہیچ ہے لیکن
اس سے کچھ بڑھ کے ہیں صاحب نظران دہلی
آئینہ ساز سکندر ہے تو جم جام فروش
وسعت آباد ہے کس درجہ جہان دہلی

---

[1] "شہر آشوب کا تحقیقی مطالعہ"، ڈاکٹر نعیم احمد ص ۲۰۰

اس لیئے خلد میں جانے کا ہر اک طالب ہے
کہ کچھ اک دور سے پڑتا ہے گمان دہلی

۱۸۵۷ء کی مسلح جد وجہد کے تباہ کن اثرات کا بیان اس طرح کیا ہے۔

کر کے برباد اسے کس کو بسائے گا فلک
کیا کوئی اور بھی ہے شہر بسان دہلی
سیلی پنجۂ بلاد ستم سے ہے ہے
نذر بیداد ہوئے منتخبان دہلی [1]

ان سب سے زیادہ غدر کے واقعات کو میر شکوہ آبادی نے پیش کیا ہے۔ میر شکوہ آبادی کو جنگ آزادی میں حصہ لینے کے جرم میں سزا بھی ہوئی۔ اسیری کے زمانے میں سیاسی قیدیوں کو جن مصیبتوں سے گزرنا پڑا اور جس طرح کا کھانا پینا، اوڑھنا، بچھونا وغیرہ انھیں دیا جاتا تھا اس کا ذکر میر نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

---

[1] "شہر آشوب کا تحقیقی مطالعہ" ڈاکٹر نعیم احمد ص ۲۰۱

غربت میں وطن خانہ بدوشوں کو ملا
زہر غربت شکر فروشوں کو ملا
جب لخت جگر کھانے لگی پیاس منیرؔ
کالا پانی سفید پوشوں کو ملا [1]

"مصائب قید" سے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

کچھ شدائد قید کے ہم دوں اگر — خون ٹپکے ہر لب تقریر سے
بانده کے زندان میں لاکھوں ستم — سہتے تھے ہم گردش تقدیر سے
پانی تھا نایاب مثل آبرو — چاہتے تھے خنجر و شمشیر سے
مثل گوہر جانتے اس کو عزیز — قطرۂ پیکاں جو ملتا تیر سے
گالیاں کھانے کو تھیں یا زخم و داغ — تھا یہ حاصل مطبخ تقدیر سے
روٹیاں گو برکی گویا ملتی تھیں — نان گندم تھی سوا اکسیر سے
گھاس ترکاری کے بدلے تھی نصیب — خشک تر تھی سبزۂ کشمیر سے
بھینس کی سانی سے بدتر دال تھی — سخت دانہ دانہ زنجبیر سے
تھا بچھونا ٹاٹ کمل اوڑھنا — گرم تر پشمینۂ کشمیر سے
کوٹھری گرمی میں دوزخ سے فزوں — دست و پا بدتر تھے آتشگیر سے

---

[1] "کلیات منیر" منیر شکوہ آبادی ص ۳۷۴

کاہے تھے موسم سرما میں یوں جیسے عریاں سردی کشمیر سے

اس جہنم کے موکل سب کے سب دشمنی رکھتے تھے بے تقصیر سے

قابل اشراف اور اہل علم تھے رنج پہنچاتے تھے ہر تدبیر سے

الہ آباد میں بھجوا دیا ظلم سے تلبیس سے تزویر سے

ننگی تلواریں کھنچی تھیں گرد و پیش نوکیں سنگینوں کی بدتر تیر سے

جو الہ آباد میں گزرے ستم ہیں فزوں تقریر سے تحریر سے

پھر ہوئے کلکتہ کو پیدل رواں گرتے پڑتے پاؤں کی زنجیر سے

ہتھکڑی ہاتھوں میں بیڑی پاؤں میں ناتوان ترقسیں کی تقویر سے

راستے میں ظلم اعدا بے شمار ہر گھڑی تھے شامت تقدیر سے

بے حواس و بے لباس و بے دیار دل گرفتہ جو دچرخ پیر سے[1]

ان کا ایک شہر آشوب ۱۸۵۷ء میں لکھنؤ کی تباہی سے متعلق ہے اس میں شرفائے لکھنؤ کی تباہی کا ماتم ہے۔ منیر کے خیال میں اس طبقہ کی تباہی پورے ملک کی بربادی تھی۔ شہر آشوب کا پہلا شعر یہ ہے۔

دل تو پژمردہ ہے داغ غم گلستاں ہوں تو کیا
آنکھیں روتی ہیں دہان زخم خنداں ہوں تو کیا

---

[1] "کلیات منیر" منیر شکوہ آبادی ص ۹۶ - ۹۸

اس دولت لاتعداد گھرانے ہندوستان کے دوسرے حصوں کی طرح لکھنؤ میں بھی تباہی کا شکار ہوئے تھے اس حقیقت کا بیان منیرؔ اس طرح کرتے ہیں۔

سینکڑوں کو لوٹ کر دو چار گھر بھر دے فلک
سب میں ماتم ہے اگر دس تہنیت خواں ہو تو کیا

امراء کی شان و شوکت کے خاتمے ان کے عالی شان محلات کی مسماری، مفلسی اور بے مائیگی کا بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں

ہو گئے برباد شاہان سلیماں منزلت
اب بلائیں ہوں تو کیا دنیا میں پریاں ہوں تو کیا

بٹ گئے پتھر جواہر پوشوں پر اے آسماں
کوڑیوں کے مول اب لعل بدخشاں ہوں تو کیا

بیگمیں، شہزادیاں پھرنے لگیں خانہ خراب
اب چڑیلیں صاحبان قصر و ایواں ہوں تو کیا

جو دوشالے دیتے تھے کملی بھی اب پاتے نہیں
پاجیوں کو تاقمہ و سنجاب ارزاں ہوں تو کیا [1]

---

[1] "شہر آشوب کا تحقیقی مطالعہ" ڈاکٹر نعیم احمد ص ۲۰۳

منظر کا دوسرا شہر آشوب قصیدے کی ہیئت میں ہے اس میں
لکھنؤ کی عمارتوں پر انگریزوں کے قبضے، لکھنؤ میں قتل عام اور
انڈومان میں محبان وطن کے قید ہونے کا تذکرہ ملتا ہے۔

سیہ کاروں کے سر پر افسر عزت نظر آئے
بنے ہیں مرغ عیسیٰ ان دنوں مرغ سلیمانی
ہوا ہے مشتری محبوس گویا برج عقرب میں
نظر آتے ہیں اہل علم و فضل اس سال زندانی
ملا ہے عہدہ خورشید شاید سعد ذابح کو
کہ لاکھوں ہر سحر تلوار سے ہوتی ہیں قربانی
قضا و جنتی معلق تھی وہ مبرم ہوگئی اب کی
لٹک کر پھانسی میں جاتی رہی بنیاد انسانی
کئی سرخی سڑک پر جانتے ہیں دیکھنے والے
ہوا ہے خون ناحق سے یہ فرش خاک افشانی
لڑے ہیں گورے کالے بند میں باہم غضب آیا
عذاب البین کے سایہ سے پہلے ہے یہ ویرانی

نکل کر بہنہ سے آنا ہوا جب اس جزیرے میں
اسیروں کی سیہ بختی سے کالا ہو گیا پانی
مٹا ہے نام شاہی ہند سے اس درجہ ان دنوں
نہیں ممکن کہ اب بانات بھی کہلائے سلطانی
عدالت ان دنوں ایسی بڑھائی ہے زمانے نے
کہ شمشیر و گلو پیتے ہیں ایک ہی گھاٹ پر پانی
پڑے ہیں ٹوکروں میں کاسہ سر بادشاہوں کے
الٰہی دوئے کس کا سر پٹک کر تاج سلطانی
نکلوا کر وطن سے پھر دیا جنگل میں لاکھوں کو
جگہ رہنے کی اب پاتے نہیں غول بیابانی
اگر اشیاء میسر ہیں تو خود محتاج ہیں قیدی
بڑی قسمت جو روٹی دال مل جائے بآسانی [1]

۱۸۵۷ء میں دلی شہر کو جو نقصانات پہنچے تھے ان کی بھی شہر آشوب سے نشاندہی کی جا سکتی ہے۔ قلعہ اور اس کے مختلف حصوں کے اجڑنے سے متعلق کچھ شعراء کے بیانات درج ذیل ہیں۔

---

[1] "کلیات منیر" منیر شکوہ آبادی ص ۹ تا ۱۳

بنا ہوا تھا جو مہتاب باغ کا گلشن

گل شگفت نہ ہے عندلیب و گل نہ چمن

کہاں وہ نرگس شہلا ہے نسترن نہ سمن

روا ہے لب کہیں اس کو کہ ہے وہ دشت محن

چمن سے سرو کو آزاد کر نکال دیا

گلے میں قمری کے دیکھا کہ طوق ڈال دیا[1]

(سوداؔ)

وہ لال پردہ کہ بس پردہ پوش عالم تھا

وہ گویا پردۂ پرنور چشم آدم تھا

وہ جبرا گاہ سلاطین و خاتم و جم تھا

وہ سجدہ گاہ بزرجمہر و زال رستم تھا

تمام کھودتے پھرتے ہیں اس جگہ مزدور

ظہور اس کا ہوا جو خدا کو تھا منظور[2]

(محسنؔ)

مکاں شکستہ ہیں مانند خاطر مایوس

1,2 ۔ شہر آشوب کا تحقیقی مطالعہ" ڈاکٹر نسیم احمد ص ۲۶۶

اجاڑ کوچے لہان دل الم مانوس
وہ شکل ہی نہ رہی شہر ہو گیا مکوس
ستم کیا فلک بدشعار نے افسوس
یہ وہ جگہ ہے جسے دیکھنے کو خلقت آئے
اور اب جو دور سے دیکھے کوئی تو غیر آئے[1]
(سالک)

نہ رہا نام کو بھی نام و نشان دہلی
مٹ گئے ہائے مکیں اور مکان دہلی[2] (کوکب)

سیل کے گولے پڑے چرخ سے فتنے برسے
منہدم کیوں کہ نہ ہو جائیں مکان دہلی[3] (کامل)

بسکہ بیداد سے لوٹے ہیں مکان دہلی
ہو رقم نوحہ شکستہ سے بیان دہلی[4] (صابر)

۱۸۵۷ء کے واقعات میں دلی کے نظر فریب اور روح افزا گلشن اور چمن بھی پامال ستم ہو گئے تھے۔

---

[1] "شہر آشوب کا تحقیقی مطالعہ" ڈاکٹر نعیم احمد ص ۲۶۷

صبا چمن میں اڑاتی ہے اپنے سر پر خاک
جہاں تھے نرگس و لالہ ہیں خس و خاشاک
ہر اک گل جو ہے پژمردہ بادل غم ناک
کیا ہے گلشن ہستی نے اب گریباں چاک[1] (سوزاں)

اردو شاعری کے عام رجحان کے مطابق ہندوستان کی عظمت رفتہ پر آنسو بہانا ہی حب الوطنی اور وطن سے ہمدردی تصور کیا جاتا تھا لیکن محمد حسین آزاد اور حالی مغرب کی مادی ترقی سے نئی روشنی لے کر قومیت اور وطن پرستی کا ایک نیا تصور پیش کرنے کے لیئے ادبی میدان میں اترے۔ ان کی ادبی کاوشوں نے اردو شعراء میں سیاسی شعور پیدا کر کے قوم اور وطن کے تصورات کو واضح کیا اور عوام کو ایک مشترکہ محاذ پر متحد ہو کر انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل کرنا قوم کی پہلی منزل قرار پائی۔ چوں کہ حب الوطنی کا جذبہ ہی عوام کو قوم پرستی، ایثار، عمل، اتحاد اور یگانگت کا درس دے کر ان کی سوئی ہوئی قوتوں میں حرکت و عمل پیدا کر سکتا ہے اس لیئے حب الوطنی کے جذبات سے محروم کوئی قوم آزادی

---

[1] "شہر آشوب کا تحقیقی مطالعہ" ڈاکٹر نعیم احمد ص ۲۶۸

کل، کیوں سے لطف اندوز نہیں ہو سکتی۔ بالخصوص ہندوستان جیسے وسیع و عریض ملک میں جہاں مختلف مذاہب میں اعتقاد رکھنے والے لوگ آباد ہیں وطن ہی ایک ایسا مرکز تھا جہاں تمام اہل وطن کو متحد کیا جا سکتا تھا۔ آزاد اور حالی کے علاوہ ان کے معاصرین نے حب الوطنی کے گیتوں سے قوم کو شجاعت، بہادری اور ایثار عمل کا پیغام دیا۔ عوام کے دل میں آزادی حاصل کرنے کی تڑپ پیدا ہوئی اور وہ سیاسی سطح پر متحد ہونے لگے۔

شعرا کی ان کوششوں کے مطالعے سے قبل اس دور کی مختلف سماجی، سیاسی، اقتصادی، مذہبی اور تعلیمی سرگرمیوں کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

انگریز ہندوستان میں تجارت کی غرض سے آئے تھے۔ اگرچہ ہندوستان برطانیہ کے صنعتی انقلاب سے دوچار نہ ہوا تھا لیکن اس انقلاب کی پرچھائیاں اس تک پہنچ چکی تھیں۔ دخانی جہاز چلنے لگے تھے۔ ۱۸۵۳ء میں ریلیں بھی بمبئی اور تھانہ کے درمیان چل چکی تھیں۔ ۱۸۵۴ء میں ڈاک ٹکٹ جاری ہو گئے تھے اس سلسلے میں ڈاکٹر عابد حسین لکھتے ہیں

"ہندوستان میں بھی صنعتی کارخانے قائم ہوئے۔ بینک کھولے گئے۔ ریلیں چلیں

..... غرض عہد جدید کے وہ سب سامان نظر آنے لگے جو ملکوں کی معاشی ترقی کا باعث ہوتے ہیں لیکن روپیہ ان کی جیبوں سے کھینچ کر باہر جاتا رہا نتیجہ یہ ہوا کہ سارا فائدہ انگریزوں کو پہنچا۔ جب دیسی صنعتیں مشینی صنعتوں کا مقابلہ نہ کرنے کی وجہ سے مٹنے لگیں تو دستکار بھی کاشتکاری کی طرف بڑھنے لگے"۔[1]

---

[1] "قومی تہذیب کا مسئلہ"، ڈاکٹر عابد حسین ص ۲۰۴-۲۰۵

کاشت کاروں کی حالت اچھی نہیں تھی۔ زمینوں پر ناقابل برداشت بوجھ پڑا تھا۔ زمیندار جو انگریز کے مفاد کے محافظ تھے زرعی ترقی سے کوئی دلچسپی نہ رکھتے تھے اور ملک مسلسل قحط سالی کا شکار تھا۔ پنڈت نہرو لکھتے ہیں

۱۸۶۱ء میں شمالی ہندوستان میں بہت
زبردست قحط پڑا بالخصوص ہمارے

صوبہ میں۔ کہا جاتا ہے متاثرہ آبادی کا
ساڑھے آٹھ فیصد سے زائد حصہ ہلاک ہوا۔
پندرہ سال بعد ۱۸۷۶ء میں اور بیس
سال بعد ۱۸۹۶ء میں ان ہی مصیبت زدہ
علاقوں میں پھر قحط پڑا۔ یہ ہندوستان کی
تاریخ کا سب سے بھیانک قحط تھا۔" [1]

ان حالات سے مجموعی افلاس کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔
ایک طرف تو کسان اس مسلسل قحط سے مقابلہ کر رہا تھا تو دوسری
طرف مہاجنی نظام اپنی جڑیں مضبوط کرتا جا رہا تھا۔ اس بحران

---

[1] JAWAHAR LAL NEHRU: GLIMPSES OF WORLD HISTORY P. 441

دور میں لوگوں کے دو بڑے دشمن ملیریا اور مہاجن تھے۔
اس کے علاوہ لگان کے ساتھ ساتھ نذرانہ، وسیدانہ، شادیانہ،
اور ہالفیانہ وغیرہ کے نام پر رقومات وصول کی جاتی تھیں۔ ایک
طرف تو یہ صورت حال تھی دوسری طرف ایک نیا طبقہ وجود
میں آ رہا تھا جسے اٹھارویں صدی کے وسط میں انگریزی اقتدار
کے عروج نے جنم دیا تھا۔ اس طبقہ میں کلرک اور اہل کار، نئے
پھوٹے جاگیردار، سرکاری دلال، وکیل، فوج کے ملازمین
اور انگریزی فیکٹریوں میں کام کرنے والے وہ مزدور شامل تھے
جو نسبتاً بہتر حالت میں تھے۔ یہ متوسط طبقہ دھیرے دھیرے
اپنی بنیادوں کو مضبوط کر رہا تھا۔ انگریزی تعلیم نے اس کے سامنے
علوم کے دروازے کھول دیئے تھے۔ سماج کی رہنمائی جاگیردارانہ
اور مذہبی عناصر کے ہاتھ سے نکل کر دھیرے دھیرے اسی طبقہ
کے ہاتھ میں آتی جا رہی تھی۔ پروفیسر احتشام حسین لکھتے ہیں

"اس وقت کی رہنمائی جاگیردار یا مذہبی
عناصر کے ہاتھ میں تھی اب وہ منتقل کر نئے
تعلیم یافتہ طبقے کے ہاتھ میں آ گئی تھی جو ایک

طرف تو اسے مفاد کا تحفظ چاہتا تھا

دوسری طرف حاکم طبقے سے تعلقات

قائم کر کے اپنی حیثیت بہتر اور مضبوط

بنانے کی فکر میں تھا۔" [1]

یہ متوسط طبقہ دیکھ رہا تھا کہ چائے، قہوہ، نیل، سن کے کارخانے یا رچہ بافی کی صنعت پر انگریز حاوی تھے ہندوستان سے خام مال برطانیہ کی منڈیوں میں جاتا تھا۔ ان حالات میں اس نئے متوسط طبقہ کے سامنے انگریزوں سے مفاہمت کے علاوہ کوئی دوسرا چارہ کار نہ تھا۔ چناں چہ ہندوستان میں جو علم کے نئے سورج کی کرنیں پھوٹی تھیں وہ ایک طرف محدود تھیں اور ہر شب کو سحر کرنے کی صلاحیت نہ رکھتی تھیں اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ متوسط طبقہ کی تحریکات بھی ایک محدود دائرے میں رہتیں۔ مغربی تعلیم اپنی وسعت میں محدود تھی اور عوام تک نہیں پہنچ سکتی تھی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ تعلیم متوسط طبقہ کے لیے تھی یہ طبقہ ماضی میں اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتا تھا اور اس پر دانشوروں کا غلبہ تھا۔

---

[1] "علی گڑھ تحریک کے اساسی پہلو" پروفیسر احتشام حسین ص ۳۱

اس طبقہ نے اپنے لیئے ان حالات میں بڑی کشمکش محسوس کی وہ ماضی کی طرف لوٹ کر نہیں جا سکتا تھا اور نہ ہی اپنے تفوق کی وجہ سے عوامی زندگی سے کوئی رابطہ رکھنا چاہتا تھا۔ سیاسی اقتدار پر اس کا بس نہیں تھا۔ چناں چہ اس دور میں ایک طویل عرصہ تک جمود طاری رہا۔

۱۸۵۷ء سے قبل ہی ہندوستان میں اصلاحی تحریکات کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا جن میں راجہ رام موہن رائے کی برہمو سماج کی تحریک بھی تھی۔ اس تحریک پر مذہبی اثرات کا غلبہ تھا۔ عہد نامہ جدید کے اخلاقیات، اسلام کی وحدانیت اور اپنشد فلسفہ کے ساتھ اس نے بین الاقوامی مذہب کا تصور پیش کیا۔ ان کے جانشین کیشب چندر سین نے بھی زیادہ تر ہندو سماج کی خرابیوں کی طرف توجہ کی۔ اس عہد میں پرم ہنس رام کرشن اور وویکانند کی تحریکات بھی اٹھیں۔ ان کا فلسفہ وحدانیت کا فلسفہ ہے۔

تھیوسوفیکل سوسائٹی کی بنیاد ایچ۔ پی۔ بلواٹسکی نے امریکہ میں ۱۸۷۵ء میں ڈالی۔ یہ سوسائٹی جس روز سے

ہندوستان میں داخل ہوئی ہندو اصیا پسندی کی تحریک سے وابستہ ہوئی مذاہبی بسنٹ بہلی تھیاسوفسٹ تھیں جنھوں نے سری کرشن اور بھگوت گیتا کا پرچار کیا۔ دیانند سرسوتی نے آریا سماج کی تحریک ۱۸۷۵ء میں شروع کی۔ بمبئی سے یہ تحریک شروع ہوئی اور پنجاب اس کا گڑھ تھا۔ دیانند کا خیال تھا کہ ہندو مذہب ابدی ہے ناقابل تغیر اور الہامی ہے۔ آریا منتخب لوگ اور وید منتخب کتاب تھی اور ہندوستان منتخب سرزمین۔ ان کی نظر میں تمام مذاہب ناقص تھے اور آریا سماج کا یہ فرض تھا کہ وہ دوسرے مذہب کے ماننے والوں کو ہندو مذہب میں داخل کرے۔

دیانند پہلے ہندو مصلح تھے جنھوں نے مسلمانوں اور عیسائیوں پر حملے کیے۔ ان کی کتاب ستیارتھ پرکاش تمام مذاہب کے خلاف تھی جس کے نتیجہ میں فرقہ وارانہ منافرت بڑھی۔ جواہر لال نہرو نے اس تحریک کو جارحانہ اور جنگجویانہ طریقہ کار کا نقطہ آغاز کہا ہے[1]

---

[1] JAWAHAR LAL NEHRU: GLIMPSES OF WORLD HISTORY P. 451

جس طرح ہندوؤں میں مختلف تحریکیں نظر آتی ہیں اسی طرح مسلمانوں میں بھی کئی تحریکیں ملتی ہیں۔ سب سے پہلے سید احمد شہید بریلوی کی تحریک نظر آتی ہے جو سکھوں کے خلاف تھی۔ سید احمد کی تحریک دراصل شاہ ولی اللہ کی تحریک کی توسیع تھی۔ اس تحریک کا نمایاں پہلو یہ تھا کہ اس کے تعلقات صرف اونچے اور متوسط طبقہ تک محدود نہیں رکھے گئے تھے بلکہ اس میں کاشتکار، دستکار اور تاجر بھی شامل تھے۔ شاہ عبدالعزیز وغیرہ نے کسی حد تک انگریزوں کی مخالفت کی۔ انھوں نے ایک بار یہ فتویٰ دیا تھا کہ انگریزی حکومت میں مسلمان پوری آزادی سے اپنے مذہبی فرائض انجام نہیں دے سکتے اس لیے ان کے خلاف جہاد کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔[1]

۱۸۶۳ء میں نواب عبداللطیف نے کلکتہ میں محمڈن لٹریری سوسائٹی قائم کی۔ حکومت کو مسلمانوں کی وفاداری کا یقین دلایا اور وہابی تحریک کے ایک ممتاز رہنما مولوی کرامت علی سے بھی یہ فتویٰ حاصل کیا کہ انگریزوں کے خلاف جہاد کرنا کسی طرح جائز نہیں ہے۔[2]

---

[1] "ہندوستانی مسلمان آئینہ ایام میں" ڈاکٹر عابد حسین ص ۶۶

[2] "ہندوستانی مسلمان آئینہ ایام میں" ڈاکٹر عابد حسین ص ۳۵

علماء کی ایک اور جماعت تھی جس نے دیوبند تحریک کی بنیاد ڈالی۔ جس میں حاجی امداد اللہ صاحب، مہاجر مکی اور مولانا محمد قاسم نانوتوی کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان لوگوں نے ۱۸۵۷ء میں جنگ میں عملاً حصہ لیا اور بعد میں درس و تدریس کے ذریعہ انقلابی خیالات کی اشاعت کی۔ لیکن مسلمانوں کی سب سے اہم تحریک سرسید تحریک تھی۔ انھوں نے ۱۸۶۳ء میں سائنٹیفک سوسائٹی قائم کی۔ اس کا کردار سیکولر تھا۔ سید امیر علی نے ۱۸۷۷ء میں نیشنل محمڈن اسوسی ایشن قائم کی تھی۔ پنجاب کے مسلمان بھی مسلمانوں کی سیاسی انجمن قائم کرنا چاہتے تھے مگر سرسید نے ان دونوں تحریکوں کی مخالفت کی۔ ۱۸۸۸ء میں انھوں نے یونائٹیڈ انڈین پیٹریاٹک اسوسی ایشن UNITED INDIAN PATRIOTIC ASSOCIATION قائم کی جس میں ہندو، مسلمان اور انگریز سب شامل تھے۔ لیکن جو حالات درپیش تھے اس میں سرسید ایک فریق کی حیثیت سے ابھرے۔ غرض کہ مختلف دھارے تھے جو فرقہ وارانہ بنیاد پر ملک میں ایک نئی تفریق کا بیج بو رہے تھے۔

ان حالات میں حکومت سے ٹکر لینا تو کجا ممکن نہ تھا
کیوں کہ متوسط طبقہ ابھی اتنا وہ اپنے طبقاتی مفادات کے تحفظ کے
لیے ایک ایسی تحریک چلانے پر مجبور تھا جو فرقہ واریت کے بجائے
طبقاتی مفاد کا تحفظ کرے۔ کانگریس کا قیام اسی سلسلہ کی ایک کڑی
تھا۔ اس کے قیام کا بنیادی مقصد عوام میں بیداری پیدا کرنا تھا۔ یہی
وہ واحد جماعت تھی جسے ملک و قوم کی عوامی جماعت کہا جا سکتا ہے۔
کانگریس میں ہر طبقہ خیال کے افراد شریک ہوئے۔ اس میں
ہندو بھی اپنی تمام احیا پرست تحریکوں کے باوجود شریک تھے
اور مسلمان بھی اپنے ایک طبقہ کی فرقہ واریت کے باوجود زور
وشور سے آئے تھے۔ علی گڈھ تحریک کی کانگریس مخالفت کے
باوجود اکثریت کانگریس میں شامل تھی۔

اس مختصر سے جائزے سے اس دور کے دو
رجحانات سامنے آتے ہیں (۱) مذہبی اصلاحی رجحان اور
(۲) سیاسی رجحان۔ مذہبی اصلاحی رجحان کی بنیاد اگرچہ تنگ نظری
پسندی پر تھی لیکن اس میں منافرت نہیں تھی۔ حالانکہ ہندوؤں
اور مسلمانوں کا ایک طبقہ انگریزوں کی سیاست کی بدولت ایک

دوسرے کو اپنے دکھوں کا ذمہ دار سمجھنے لگا تھا۔ مسلمان احیا پرست یہ سمجھ رہے تھے کہ ہندوؤں سے اختلاط نے ان کی اسلامی تہذیب کے خط و خال مسخ کر دیئے ہیں اور ہندوؤں کو احساس تھا کہ ان کی تہذیب برشٹ کر دی گئی ہے۔ سیاسی رجحان کے تحت مسلمانوں کو یہ احساس دلایا گیا تھا کہ وہ ہزار برس تک اس ملک پر حکمراں رہ چکے ہیں اس لیے ان کا شاندار ماضی انہیں آواز دے رہا ہے اور ہندوؤں میں یہ رجحان پیدا کر دیا گیا تھا کہ یہ ملک ان کا ہے اس لیے انہیں محکوم کی حیثیت سے نہیں بلکہ حکمراں کی حیثیت سے رہنا چاہیے۔ اس کشمکش نے رواداری اور باہمی احترام کے جذبات کو یکسر فراموش کر دیا۔

یہی وہ حالات تھے جن میں اردو شاعری نے مشترکہ تہذیب کی وارث کی حیثیت سے نہ صرف اتفاق، اتحاد اور یگانگت کی قندیلیں روشن کیں بلکہ غدر کے بعد اس کا سب سے بڑا کارنامہ اس دور کشاکش میں قومیت، وطنیت اور حب الوطنی کے شعور کو پروان چڑھانا ہے اور یہ حب الوطنی کا تصور احساس غلامی اور انگریزوں سے نفرت کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اسی کے ساتھ ساتھ مثبت انداز میں شعرا نے حب الوطنی پر نظمیں لکھیں

اس سلسلے میں سب سے اہم نام حالی کا ہے۔

حالی نے قیام لاہور کے دوران اپنی مشہور نظم "حب وطن" لکھی۔ اس نظم کا موضوع وطن کی محبت ہے اور حالی کی اس ذہنی کیفیت نے اس نظم کی تخلیق کی ہے جو لاہور کے دوران قیام میں اپنے آبائی وطن سے دور ہونے کے باعث ان پر چھائی ہوئی تھی اس لیے اس میں جذبہ حب وطن کی نوعیت انفرادی ہے لیکن اس کے باوجود کہیں کہیں اس میں حب وطن کا اجتماعی تصور بھی اپنی جھلک دکھاتا ہے۔ حالی ایک نفسیاتی نکتے سے نظم کو شروع کرتے ہیں وہ نکتہ یہ ہے کہ مناظر فطرت اگرچہ بظاہر حسین ہوتے ہیں لیکن ایک غریب الوطن کے لیے ان میں وہ دلکشی باقی نہیں رہتی جو وطن میں محسوس ہوتی ہے۔ وطن سے دوری کی کیفیت کو انھوں نے بہت تفصیل سے بیان کیا ہے۔

اے سپہر بریں کے سیارو — اے فضائے زمیں کے گلزارو
اے پہاڑوں کی دلفریب فضا — اے لب جو کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا
اے عنادل کے نغمہ سحری — اے شب ماہتاب تاروں بھری
اے نسیم بہار کے جھونکو — دہر ناصدار کے دھوکو

تم ، اب سال میں ہو یوں تو عزیز　　تھے وطن میں مگر کچھ اور ہی چیز

جب وطن میں ہمارا تھا رہنا　　تم سے دل باغ باغ تھا اپنا

تم سے مسکا تھا رخ شنائی　　تم سے پاتا تھا دل شکیبائی

آن اک اک ادا تمہاری بھاتی تھی　　جو ادا تھی وہ جی لبھاتی تھی

اے وطن اے مرے بہشت بریں　　کیا ہوئے تیرے آسمان و زمیں

رات اور دن کا وہ سماں نہ رہا　　وہ زمیں اور وہ آسماں نہ رہا

تیری دوری ہے موردِ آلام　　تیرے چھٹنے سے چھٹ گیا آرام

کاٹے کھاتا ہے باغ بن تیرے　　گل ہیں نظروں میں داغ بن تیرے

مٹ گیا نقش کامرانی کا　　تجھ سے تھا رف زندگانی کا

جو کہ رہتے ہیں تجھ سے دور سدا　　ان کو کیا ہوگا زندگی کا مزا

ہو گیا یاں تو دو ہی دن میں یہ حال　　تجھ بن ایک ایک پل ہے ایک ایک سال

اس نظم میں حالی نے جذبہ حب الوطنی کی اہمیت کو پیش کرتے ہوئے بعض تاریخی واقعات کو بھی نظم کیا ہے اور تاریخی تبدیلیوں کے پس منظر میں یہ بات واضح کی ہے کہ تاریخ کی انقلابی تبدیلیاں بھی اس جذبہ کو لوگوں کے دلوں سے نہ نکال سکیں۔ آریا جب اس ملک میں آئے تو یہاں کے رہنے والوں نے اپنے آپ کو شدر اور

[illegible] لیکن وطن کو سرک نہیں کیا۔ راجندر جی
جب بن باس میں تھے ایک لمحے کو بھی اجودھیا کی یاد ان کے دل سے اوجھل
نہیں ہوئی۔ آنحضرت صلعم اگرچہ یثرب کی طرف چلے گئے لیکن
وہاں کی یاد ان کو برابر آتی رہی۔ اسی طرح حضرت یوسف کا قصہ
بیان کیا ہے اور مختلف مثالوں سے حب وطن کی اہمیت ذہن نشین
کرائی ہے لیکن پھر یہاں سے گریز کیا ہے اور یہ بات ظاہر کی ہے کہ
حب وطن کی نوعیت صرف انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی بھی ہے۔ یہاں
پہنچ کر حالی نے اس جذبہ کو قومی زاویہ نظر سے دیکھا ہے اور بغض و
نفرت جو وطن میں موجود ہے اس کو ختم کر کے محبت کا پیام دیا ہے
ان کے نزدیک بغیر اس کے حب وطن کوئی معنی نہیں رکھتا۔ وہ
براہ راست افراد کو مخاطب کر کے کہتے ہیں

بیٹھے بے فکر کیا ہو ہم وطنو! اٹھو اہل وطن کے دوست بنو
مرد ہو تو کسی کے کام آؤ ورنہ کھاؤ، پیو، چلے جاؤ
جب کوئی زندگی کا لطف اٹھاؤ دل کو دکھ بھائیوں کے یاد دلاؤ
پہنو جب کوئی عمدہ پوشاک کرو دامن سے تا گریباں چاک
کھانا کھاؤ تو جی میں شرماؤ ٹھنڈا پانی پیو تو اشک بہاؤ

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے — زندگی سے ہے جن کا دل بیزار

مایوسی و ناکامی سے اُمت کو بچاؤ — تیرنے والو ڈوبتوں کو تیراؤ

ہیں ملے تم کو چشم و گوش اگر — لو جو لی جائے کوئی کر کی خبر

تم اگر ہاتھ پاؤں رکھتے ہو — لنگڑے لولوں کو کچھ سہارا دو

ہو مسلماں اس میں یا ہندو — بودھ مذہب ہو یا کہ ہو برہمو

جینی ہووے یا کہ ہو جنتی — جین مت ہووے یا ہو بشنوی

سب کو میٹھی نگاہ سے دیکھو — سمجھو آنکھوں کی پتلیاں سب کو

ملک ہیں اتفاق سے آزاد — شہر ہیں اتفاق سے آباد

قوم پر کرتے ہو اگر احساں — تو دکھاؤ کچھ اپنا جوش یہاں

کچھ دنوں عیش میں خلل ڈالو — پیٹ میں جو ہے سب اُگل ڈالو

علم کو کر دو کوہ کو وادیاں — ہند کو کر دکھاؤ افلستاں

قوم کی عزت اب ہنر سے ہے — علم سے یا کہ سیم و زر سے ہے

کوئی دن میں وہ دور آئے گا — بے ہنر بھیک تک نہ پائے گا

نہ رہیں گے سدا یہی دن رات — یاد رکھنا ہماری آج کی بات

گر نہیں سنتے قولِ حالی کا — پھر نہ کہنا کہ کوئی سمجھاتا تھا[1]

---

[1] "مجموعہ نظم حالی" ظہیر احمد صدیقی ص ۵۸ - ۶۰

اور حالی اس رنگ میں زندگی کے اصلاحی پہلو کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ قوم کو عمل کرنے کے لیئے اکساتے ہیں تعمیری کاموں کی طرف راغب کرتے ہیں تاکہ وطن میں خوشحالی کا دور دورہ ہو سکے۔ اس طرح حالی کے یہاں جب وطن کا انفرادی تصور اپنے دائرے سے نکل کر اجتماعی اور قومی حیثیت حاصل کر لیتا ہے۔

وطن کا جیتا جاگتا تصور ہم کو حالی کے یہاں ملتا ہے اس سے پہلے مفقود ہے۔ وطن کی محبت اور آزادی کا احساس اس وقت زیادہ ہوتا ہے جب انسان کے ذہن میں غلامی کا احساس ہو اور اس سے نفرت کا جذبہ پیدا ہو جائے۔ حالی وطن کے تصور کو کتنی خوبی سے واضح کرتے ہیں۔

ٹکڑے ہوتے ہیں سنگ غربت میں — موکھ جاتے ہیں روکھ فرقت میں
جا کے کابل میں آم کا پودا — کبھی پروان چڑھ نہیں سکتا
مچھلی جب چھوٹتی ہے پانی سے — ہاتھ دھوتی ہے زندگانی سے
کہیے جب وطن اسی کو اگر — ہم سے حیوان نہیں ہیں کچھ کم تر[1]

پھر آخر حب الوطنی کا وہ کونسا تصور ہے جس کی طرف حالی ہماری

---

[1] "تحقیقی مطالعہ حالی" ظہیر احمد صدیقی ص ۳۷

کو مسدس مدوجزر اسلام کہا جاتا ہے۔ حالی کا نظریہ ان اشعار میں کھل کر سامنے آتا ہے وہ قوم کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو سنبھالنے کے لیے ایک ماہر ملاح کی تلاش میں نظر آتے ہیں۔

ہے کوئی اپنی قوم کا ہمدرد — نوعِ انساں کا جس کو سمجھے فرد
جس پر اطلاق آدمی ہو صحیح — جس کو حیواں پہ دے سکیں ترجیح
قوم پر کوئی زد نہ دیکھ سکے — قوم کا حال بد نہ دیکھ سکے [1]

آل احمد سرور حالی کی حب الوطنی کے بارے میں لکھتے ہیں

"حالی کی مثنوی حب وطن آج بھی نئی ہے

..... حالی کا یہ شریف اور مہذب پیغام

ہندوستان کے لیے آج بھی نجات کا باعث

ہو سکتا ہے۔" [2]

حالی نے سیاسی صورت حال پر حقیقت پسندانہ نظر ڈالی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ہندوستان کی محکومی اور بے بسی کو شدت سے محسوس کر رہے تھے۔ "آزادی کی قدر" کالے اور گورے

---

[1] "تحقیقی مطالعہ حالی" ظہیر احمد صدیقی ص ۴۷

[2] "تنقید کیا ہے؟" بار پنجم آل احمد سرور

ل عرب کا مدلل اظہار ہے۔ انگلستان کی آزادی اور ہندوستان کی غلامی، اسی احساس کو ظاہر کرتے ہیں۔ حالی نے اپنی حب الوطنی کا اظہار اپنے ہم وطنوں کی محکومی کے تلخ احساس کے اظہار کے ذریعہ کیا ہے۔ وہ اس محکومی کی حالت کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے اپنے ان جذبات کو کہیں ہندوستانیوں کو نصیحت کے انداز میں کہیں مشرق و مغرب کے موازنے کی صورت میں تو کہیں علیٰحدہ قومیت کے تصور کی شکل میں بیان کیا ہے۔

"آزادی کی قدر" میں کہتے ہیں

ایک ہندی نے کہا حاصل ہے آزادی جنھیں
قدر داں ان سے بہت بڑھ کر ہیں آزادی کے ہم
ہم کہ غیروں کے سدا محکوم رہتے آئے ہیں
قدر آزادی کی جتنی ہم کو ہو اتنی ہے کم
تعریف الاشیاء بالاضداد ہے قول حکیم
دے گا قیدی سے زیادہ کون آزادی پہ دم [1]

"انگلستان کی آزادی اور ہندوستان کی غلامی" میں کہتے ہیں

---

[1] "دیوان حالی" الطاف حسین حالی ص ۲۵

جیسے ہیں آزاد ہو جاتا ہے جب لیتا ہے سانس
یاں غلام آکر، کرامت ہے یہ انگلستان کی
اس کی سرحد میں غلاموں نے جوں ہی رکھا قدم
اور کٹ کر پاؤں سے اک اک کے بیڑی گر پڑی
قلب ماہیت میں انگلستان ہے گر کیمیا
کم نہیں کچھ قلب ماہیت میں ہندوستان بھی
آن کر آزاد، یاں آزاد رہ سکتا نہیں
وہ رہے ہو کر غلام، اس کی ہوا جن کو لگی [1]

محمد حسین آزاد نے بھی حب وطن پر نظم لکھی۔ حب وطن ان کی شاعری کا اہم موضوع ہے۔ جدید رجحانات اور انگریزی ادب سے کسی حد تک واقفیت نے آزاد کے تصور حب وطن میں نمایاں تبدیلی پیدا کی۔ اپنی مثنوی حب وطن میں انھوں نے انگریزی شعر و ادب سے چند مثالیں دی ہیں کہ کس طرح یورپ کے افراد وطن اور اہل وطن کی بھلائی کی خاطر کسی بھی ایثار سے دریغ نہیں کرتے اور ذاتی مفاد پر قوم کے اجتماعی مفاد کو ترجیح دیتے ہیں۔

---

[1] "دیوان حالی" الطاف حسین حالی ص ۲۵

اس لیے نور میں حب الوطنی بہشتی سے بھی عبادت ہے۔ اس کا
روحانی پس منظر یہ ہے کہ وہ رحمت خدا ہے۔

اب میں تمہیں بتاؤں کہ حب وطن ہے کیا
وہ کیا چمن ہے اور وہ ہوائے چمن ہے کیا
وہ رحمت خدا ہے کہ بندوں پہ عام ہے
وہ لطف عام جس سے جہاں شاد کام ہے
وہ نور مہر جس سے زمانے میں نور ہے
وہ نور ذرے ذرے پہ جس کا ظہور ہے
حب وطن ہے جلوہ اسی نور پاک کا
اور روشن اس کے نور سے عالم ہے خاک کا
ہو مہر میں یہ نور تو اس کو کرن کہیں
گر دل سے جلوہ گر ہو تو حب وطن کہیں
رکھتا جو سب پہ لطف و کرم کی نگاہ ہو
اور دل سے ہر بشر کے لیے خیر خواہ ہو
آوارۂ سفر ہو کہ موجود گھر میں ہو
ہاتھ اپنا جیب نفع میں ہو یا ضرر میں ہو

حال میں رہیں اے اہل وطن عزیز
اور ہو وہیں نیک و بد روش بان وتن عزیز

اس میں آزاد ہندوستانیوں کو ہم وطنوں سے محبت و الفت کا درس دیتے ہیں تاکہ ان میں ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو۔ نئے علم و ہنر کی روشنی پھیلے اور ملک معاشی و معاشرتی لحاظ سے ترقی کر سکے۔

آزاد کا حب وطن کا تصور اعلیٰ ترین تصور ہے۔ وہ تاریخ عالم کے مختلف واقعات بیان کرنے کے بعد ڈاکٹر ہملٹن کا قصہ بھی حب وطن کے ذیل میں درج کرتے ہیں۔

فرخ سیر تھا ہند میں فرمانروائے ملک
اور غیرت نیم وصباتھی ہوائے ملک
پیرہند پر تھا حادثہ غم عجب پڑا
یعنی کہ بادشاہ تھا خود جاں بلب پڑا
اس فرخ کا تصور پڑا تھا مزاج میں
تھا مبتلا وہ اک مرض لاعلاج میں
سب اہل عقل ہوش و حواس اپنے کھو چکے
سارے طبیب ہاتھ علاجوں سے دھو چکے

ہر اس مسیح دم نے جو آکر کیا علاج
ایسا بہ حسب طبع موافق پڑا علاج
لگ یاد وا بہ کار دعا ہو گئی اسے
اور تین چار دن میں شفا ہو گئی اسے
نوبت خوشی کی بج گئی سارے جہان میں
اور جان تازہ آ گئی اک اک جان میں
فرخ سیر کہ شاہ سخاوت مآب تھا
بحر کرم کا جس کے ہمکو را سحاب تھا
اک جشن عام اس نے کیا دھوم دھام سے
اور شور تہنیت کا اٹھا خاص و عام سے
حاضر ہوئے امیر و وزیر آگے سامنے
اور اس طبیب کو کہا بلوا کے سامنے
لا دامن امید کو بھر دیں ابھی اسے
تا عمر پھر تو پائے نہ خالی کبھی اسے
دریا دلی طبیب کی دیکھو مگر ذرا
ڈالی نہ اس نے لعل و گہر پر نظر ذرا

حب الوطن بے جوش سے بیتاب ہو گیا
دل آب ہو کے سینے میں سیماب ہو گیا
کی عرض ہاتھ جوڑ کے خدمت میں شاہ کی
بندہ کو آرزو نہیں کچھ عز و جاہ کی
زر کی ہوس نہ مال کی ہے جستجو مجھے
پر آرزو جو ہے تو یہی آرزو مجھے
کچھ ایسا میرے واسطے انعام عام ہو
جس سے مرا تمام وطن شاد کام ہو
بولا یہ شاہ اس کا بھی مجھ پر مدار ہے

جو مانگنا ہے مانگ تجھے اختیار ہے
تب عرض کی طبیب نے یوں بادشاہ سے
روشن جلال شاہ ہو خورشید و ماہ سے
تھوڑی زمیں نوامی دریا کنار میں
مجھ کو عطا ہو مملکت شہریار میں
تا اس طرف جو میرے وطن کے جہاز آئیں
اور ان میں تا جران ذوی الامتیاز آئیں

کچھ اس پہ ہو وے راہ نہ بیم و زوال کو
آرام سے اتاریں یہاں اپنے مال کو
اور جنس جو کہ لائیں وہ نزدیک و دور سے
محصول سب معاف ہو اس کا حضور سے
پہلا علاج گرچہ بہت کارگر پڑا
یہ نسخہ لیکن اس سے سوا پر اثر پڑا
اس کی بھی یعنی کلفت غم دور ہو گئی
اور تی جو کچھ کہ بات وہ منظور ہو گئی
ہر چند اسے نہ فائدہ سیم و زر ہوا
پر نفع بہر اہل وطن کس قدر ہوا

ہملٹن کا قصہ بیان کرنے کے بعد انھوں نے ہندوستان میں حب الوطنی کے فقدان پر درد ناک اظہار کیا ہے۔

اے آفتاب حب وطن! تو کدھر ہے آج
تو ہے کدھر کہ کچھ نہیں آتا نظر ہے آج
تجھ بن سب اہل درد ہیں دل مردہ ہو رہے
اور دل کے شوق سینوں میں افسردہ ہو رہے

ٹھنڈے ہیں یوں دلوں میں ترے جوش ہو کئے
یوں سب ترے چراغ ہیں خاموش ہو رہے
حب وطن کی جنس کا ہے قحط سال کیوں
حیراں ہوں آج کل ہے پڑا اس کا کال کیوں
کچھ ہو گیا زمانہ کا الٹا چلن یہاں
حب الوطن کے بدلے ہے بغض وطن یہاں
بن تیرے ملک ہند کے گھر بے چراغ ہیں
جلتے عوض چراغوں کے سینوں میں داغ ہیں

کب تک شب سیاہ میں عالم تباہ ہو
اے آفتاب ادھر بھی کرم کی نگاہ ہو
الفت سے گرم سب کے دل سرد ہوں بہم
اور جو کہ ہم وطن ہوں وہ ہمدرد ہوں بہم
تا ہو وطن میں اپنے زر و مال کا وفور
اور مملکت میں دولت و اقبال کا وفور
سبز نیر جوش حب وطن سب کے جام ہوں
سرشار ذوق و شوق دل خاص و عام ہوں [1]

---

[1] "نظم آزاد" مولانا محمد حسین آزاد ص ۱۱۴

۱۹۴۷ء میں لکھا کہ ہندوستان کے عوام غلامی کے اثرات سے مایوس اور مضمحل ہوتے جا رہے ہیں ان میں ترقی کرنے اور آگے بڑھنے کا جذبہ باقی نہیں رہا چناں چہ انھوں نے قوم میں عزم و عمل بیدار کر کے حب وطن کے ساتھ عزم و عمل کی طرف راغب کرنے کی کوشش کی۔

یار و چلو چلو نہ کرو انتظار تم　　کرتے ہو کیا امید یمین و یسار تم
میدان عزم و بزم کے ہو شہسوار تم　　بڑھ جاؤ گے کرو گے اگر مار مار تم
چلا رہی ہے ہمت مردان چلے چلو

رکھو رضاے عام پہ اپنا مدار تم　　اور ہو کبھی صلے کے نہ امیدوار تم
عزت خدا جو دے تو پھر کیوں ہو خوار تم　　دو رخ کو آب فخر سے رنگ بہار تم
گلشن میں ہو کے باد بہاراں چلے چلو [1]

اسمٰعیل میرٹھی بھی اپنے عہد کے معاشرتی حالات سے پوری طرح واقف تھے۔ انھوں نے اخلاقی اور معاشرتی مسائل کو موثر طریقہ پر بیان کیا ہے۔

---

[1] "اردو میں قومی شاعری کے سو سال" مرتبہ علی جواد زیدی ص ۹۶

ملے مسلک و دیں جو آزاد رہ کر
تو وہ خوف و ذلت کے حلوے سے بہتر
جو ٹوٹی ہوئی جھونپڑی بے خطر ہو
بلی اس محل سے جہاں کچھ خطر ہو [1]

حب الوطنی کا ایک جزو اتفاق و یکجہتی بھی ہے اس لیئے وہ قوم کو متحد رہنے کی تلقین کرتے ہوئے کہتے ہیں

جب تک سبق ملاپ کا یاد رہا
بستی میں ہر اک شخص دل شاد رہا
جب رشک و حسد نے پھوٹ ان میں ڈالی
دونوں میں سے ایک بھی نہ آباد رہا [2]

اسمٰعیل میرٹھی کو ایک بہتر زمانے کی پوری امید تھی لیکن یہ اسی وقت ممکن تھا جب پوری قوم حب الوطنی کے جذبہ سے سرشار ہو کر فرقہ واریت اور تعصب کو چھوڑ کر ملک کی تعمیر میں حصہ لے۔

وہ ایسے ہی زمانے کا خواب دیکھ رہے تھے۔

عقیدوں کی مٹ جائے گی جب رقابت مذاہب کو ہوگی تعصب سے فرصت

[1,2] "اردو میں قومی شاعری کے سو سال" مرتبہ علی جواد زیدی ص ۱۳۹

مرا ان کی ہر دہ بائے کی اور طافت　　کرو صبر آتا ہے اچھا زمانہ

کریں سب مدد ایک کی ایک مل کر　　یہی بات واجب ہے ہر مرد و زن پر

بے ہاتھ سب کا تو اٹھ جائے چھپر　　کرو صبر آتا ہے اچھا زمانہ [1]

"کو رانہ انگریز پرستی" میں انھوں نے ان ہندوستانیوں پر چوٹ کی ہے جو اپنی تہذیب کو چھوڑ کر انگریزوں کی تہذیب کو اپنا رہے تھے جس سے وہ اپنی شناخت بھی کھو رہے تھے۔

رہا وہ جرگہ جسے چڑ گئی ہے انگریزی
سو واں خدا کی ضرورت نہ انبیاء درکار

وہ آنکھ میچ کے ہر خود غلط بنے ایسے
کہ ایشیا کی ہر اک چیز پر پڑی دھتکار

جو اردلی میں ہے کتا تو ہاتھ میں اک بید
بجاتے جاتے ہیں سیٹی سلگ رہا ہے سگار

وہ اپنے آپ کو سمجھے ہوئے ہے جنٹلمین
اور اپنی قوم کے لوگوں کو جانتے ہیں گنوار

نہ کچھ ادب ہے نہ اخلاق، نے خدا ترسی

---

[1] "اردو میں قومی شاعری کے سو سال" مرتبہ علی جواد زیدی ص ۱۴۰

لئے ہیں ان بے خیالات سب سمندر پار
وہ اپنے زعم میں لبرل ہیں یا ریڈیکل ہیں
مگر ہیں قوم کے حق میں بصورت اغیار
نہ انڈین میں رہے وہ نہ وہ بنے انگلش
نہ ان کو چرچ میں آنر نہ مسجدوں میں بار
نہ کوئی علم نہ صنعت نہ کچھ ہنر نہ کمال
تمام قوم کے سر پر سوار ہے ادبار [1]

انیسویں صدی کی آخری دہائی میں اردو کے بہت سے شاعر جیسے سرور جہاں آبادی، اقبال، شبلی، اکبر وغیرہ نے اپنی شاعری کا آغاز کر دیا تھا۔ آئندہ باب میں ان کا ذکر ان کے عہد کی تحریکات کے مختصر جائزہ کے بعد کیا گیا ہے۔

چوتھا باب

بیسویں صدی کے آغاز کا سیاسی پس منظر اور حب الوطنی کا نیا شعور

انیسویں صدی کی آخری دہائی سے ہی تفریق
نسدانہ اور تعصب فرقہ وارانہ ذہنیت بیدار ہونے لگی تھی۔
ڈاکٹر ناداچند لکھتے ہیں کہ

"۱۸۹۳ء میں تلک نے گائے کی رکھشا
تحریک شروع کی اس لیئے کہ انھیں شبہ
تھا کہ انگریز مسلمانوں کی تائید اور
سرپرستی کر رہے ہیں اسی سال انھوں
نے قدیم گنپتی کے جلوس کی تنظیم کی یہ
ہندو میلہ تھا۔ ۱۸۹۵ء میں انھوں
نے شیواجی کے میلہ کی بنیاد ڈالی۔ اس
میں کوئی شک نہیں کہ دونوں تیوہاروں
نے عوام کے درمیان سیاسی جوش و
خروش پیدا کیا اور سیاسی نظریات کی
تبلیغ میں مدد کی شاید مہاراشٹرا میں
جہاں ہندوؤں کی بڑی اکثریت تھی یہ

اساں تھا کہ لوگوں کو مرہٹہ تحریک کی عظمت
یاد دلائی جائے۔ بلاشک و شبہ تلک بہت بڑے
قوم پرست تھے لیکن رانا ڈے جیسے لبرل اور
مسلمانوں کی تنقید بے بنیاد نہیں ہے کہ سیاست
میں مذہب کے امتزاج سے بہت سے خطرات تھے
جو بعد کے حالات میں ظہور پذیر ہوئے اور
بہرحال ایک ایسے سماج میں جہاں مختلف مذاہب
ہوں اسے غلط سمجھا جا سکتا تھا۔" [1]

"گنپتی اور شیواجی کے نام سے جن تحریکوں کو
شہرت دی گئی ان سے مسلمانوں کے جذبات
برانگیختہ ہو گئے۔ ۱۸۹۳ء میں ہندوؤں
اور مسلمانوں کے بلوے کی آگ پانچ روز تک
بمبئی میں بھڑکتی رہی۔ وہ اس زمانے میں نئی
اور عجیب سمجھی جاتی تھی۔ رنگون، بریلی اور
اعظم گڈھ میں صرف چھ ہفتے پہلے اس قسم کے

---

[1] Dr. TARACHAND: HISTORY OF FREEDOM MOVEMENT
P. 578-79

مساوات ہو چکے تھے اور دونوں قوموں
میں اتحاد کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔" [1]

اس پس منظر میں لارڈ کرزن وائسرائے ہو کر آئے اور بنگال ان کی خصوصی توجہات کا مرکز بن گیا۔ ڈاکٹر عابد حسین لکھتے ہیں

"چونکہ مشرقی بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت تھی اس لیے انہیں یہ توقع تھی کہ الگ صوبہ بن جانے کے بعد مسلمان وہاں کے انتظام میں زیادہ حصہ پانے کا مطالبہ کریں گے جس کی وجہ سے ان میں اور ہندوؤں میں سیاسی کشمکش شروع ہو جائے گی۔ ..... لارڈ کرزن نے مسلم عوام کے پبلک جلسے کر کے انہیں یہ سمجھایا کہ مشرقی بنگال کو ایک الگ صوبہ بنانے کا خاص مقصد یہ ہے کہ وہ ایک مسلم صوبہ ہو جس میں اسلام اور اس کے پیروؤں کو غلبہ حاصل ہو" ..... [2]

---

[1] "انگریزی عہد میں ہندوستانی تمدن کی تاریخ" عبداللہ یوسف علی ص ۳۳۱

[2] "ہندوستانی مسلمان آئینہ ایام میں" ڈاکٹر عابد حسین ص ۸۸-۸۹

' الٰہ آباد حسن لکھتے ہیں۔

" صدی کے آخری دس سال میں ہندوؤں
میں فرقہ وارانہ شعور کے ابھرنے سے جس
کا اظہار دکن میں گنپتی کے جلوس اور ان داد
گاؤ کشی کی انجمن کی شکل میں اور شمالی ہند میں
آریا سماج اور ہندی کی تحریک کی صورت میں
ہوا تھا مسلمانوں میں خوف اور شبہ کی ایک
فضا پیدا ہو گئی تھی۔ ..... ۱۹۰۶ء میں
نواب محسن الملک ایک عرضداشت پر ملک
کے مختلف حصوں سے چار ہزار مسلمانوں کی
دستخط لے کر پینتیس سربرآوردہ مسلمان
زمینداروں، تعلقداروں اور وکیلوں کے
ایک وفد کے ساتھ وائسرائے کی خدمت
میں حاضر ہوئے۔ وائسرائے نے ان کے
معروضات کو ہمدردی سے سنا اور
واثق وعدہ کیا کہ نئی تنظیم میں جداگانہ

انتخاب کے ذریعہ سے مسلمانوں کے حقوق
کا تحفظ کیا جائے گا..... اس کے تین
مہینہ کے اندر مسلمانوں کی ایک جداگانہ
سیاسی انجمن قائم کرنے کا کام جو نواب
وقار الملک اور دوسرے لیڈروں کی
کوشش سے کئی برس سے نہیں ہو سکا تھا
حکومت کے فیضان سے بآسانی انجام پا گیا
اور دسمبر ۱۹۰۶ء میں ڈھاکہ میں سر
برآوردہ مسلمانوں کے ایک جلسے میں
جو نواب وقار الملک کی صدارت میں
ہوا آل انڈیا مسلم لیگ کے قائم کرنے کا
فیصلہ ہو گیا۔" [1]

مسلم لیگ کے قیام کے فوراً بعد ہی ایک سیاسی تنظیم احرار لیگ قائم ہوئی جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان بھی انگریزوں کے خلاف جد وجہد اور سیاسی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں اور

---

[1] "ہندوستانی مسلمان آئینہ ایام میں" ڈاکٹر عابد حسین ص ۸۸-۹۱

ملک کی آزادی کی تحریک میں دوسری قوموں سے پیچھے نہ رہیں۔ ڈاکٹر محمد اشرف احرار لیگ کے متعلق اپنے مقالے "علی گڈھ کی سیاسی زندگی" میں رقم طراز ہیں

"مسلم لیگ کے اجلاس ڈھاکہ کے سلسلے میں جہاں محسن الملک، آغا خان اور حکومت کے دوسرے معتمد ڈھاکہ پہنچے وہاں نوجوانوں کے ترجمانوں میں محمد علی اجمل خاں، آفتاب احمد خاں، مظہر الحق، علی امام، ظفر علی خاں، فضل الحق وغیرہ بھی اس اجلاس میں شریک ہوئے اور ڈھاکہ اجلاس کے فوری بعد ان نوجوانوں نے احرار لیگ کی بنیاد ڈال کر مسلمانان ہند کو وطن کی آزادی میں شریک ہونے کی دعوت دی۔"[1]

---

[1] مضمون "علی گڈھ کی سیاسی زندگی" ڈاکٹر محمد اشرف مطبوعہ علیگڈھ میگزین شمارہ خصوصی "علیگڈھ نمبر" ۱۹۵۳-۵۴ ص ۱۶۳-۱۶۴

اور سرگانگریس اور مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں سے خوفزدہ ہو کر مسلسل یہ کوشیش کرنے لگے کہ ہندوستانی آپس میں متحد نہ ہوں۔ انھوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں پھوٹ ڈلوانے کے لیئے ان میں فرقہ وارانہ احساس پیدا کیا جس کے نتیجہ میں مسادات برپا ہوئے۔

جس زمانے میں تقسیم بنگال کی مخالفت اور سودیشی تحریک زوروں پر تھی اس وقت مشرقی بنگال میں کئی مقامات پر فرقہ وارانہ مسادات ہوئے۔ ۱۴ مارچ ۱۹۰۷ء کو کومیلا (Comilla) میں ہندو مسلم مساد ہوا۔ اس سلسلے کا سب سے سنگین مساد جمال پور (ضلع میمن سنگھ) میں ہوا[1] اس کے علاوہ ہندوستان کے مختلف صوبوں میں بھی مسادات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

تقسیم بنگال کی مخالفت کے ساتھ سودیشی تحریک پر کانگریس میں اختلافات پیدا ہو گئے جس کے نتیجہ میں کانگریس

---

[1] STRUGGLE FOR FREEDOM: R.C MAJUMDAR VOL XI P.55

• ... میں منعقد ہوئی۔ تو کھلے طور پر اعتدال
... اور ملک کی رہنمائی میں انتہا پسند ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔

1909ء میں ہندوستانی کونسلوں کا قانون اصلاحات
منٹو مارلے (فارم) پاس ہوا۔ اس کی رو سے مرکزی لیجسلیٹو کونسل
اور صوبے کے کونسلوں کے ممبروں کی تعداد بڑھا دی گئی لیکن
ان کونسلوں کو کوئی ٹھوس اختیار نہیں دیا گیا۔ ان کا کام صرف
انگریز گورنر کو مشورہ دینا تھا۔ بقول ڈاکٹر سید عابد حسین

"... کانگریس کی انتہا پسند پارٹی تو ایک
طرف اعتدال پسند پارٹی بھی ان اصلاحات
سے مطمئن نہیں ہوئی تھی۔" [1]

اس کے بعد اندرون اور بیرون ملک چند ایسے واقعات رونما
ہوئے جن سے مسلمانوں میں انگریزوں کے خلاف نفرت اور
بے اطمینانی کے رجحان کو تقویت ملی اور ان کی سیاسی سرگرمیاں
تیز سے تیز تر ہوتی گئیں۔ 1911ء میں دہلی دربار کے موقع پر
جارج پنجم نے تقسیم بنگال کی تنسیخ کا اعلان کر دیا۔ حالانکہ اس

---

[1] "قومی تہذیب کا مسئلہ" ڈاکٹر سید عابد حسین ص ۱۸۷

[illegible] نے لمحاتی طور پر وقت مسلمانوں کو اس بات کا یقین دلایا گیا تھا
[illegible] ان کے لیئے مفید ہے۔ ابھی مسلمانوں کے دلوں میں شدید غم و غصہ
تھا ہی کہ جولائی ۱۹۱۳ء میں کانپور کی مسجد مچھلی بازار کا واقعہ
پیش آگیا۔ اس واقعہ نے مسلمانوں کے جذبات کو اور زیادہ مشتعل
کر دیا۔ مقامی مسلمانوں کے احتجاج کے باوجود کانپور کے میونسپل
عہدیداروں نے پولیس کے ایک دستے کی مدد سے مسجد مچھلی بازار
کے ایک حصہ کو شہید کر ڈالا۔ اس سلسلے میں مولانا محمد علی نے یو۔پی
کے گورنر جیمس مسٹن سے رجوع کیا تاکہ مسئلہ کا کچھ حل نکالا جا سکے
لیکن کوئی کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ ۳ر اگست ۱۹۱۳ء کو مولانا
آزاد سبحانی کی صدارت میں کانپور میں منعقد ہونے والے ایک
جلسے میں یہ طے ہوا کہ مسجد کے منہدم حصے انہی اینٹوں سے پھر سے
تعمیر کیئے جائیں۔[1] چناں چہ کچھ مسلمان مردوں اور بچوں پر
مشتمل ایک مجمع مسجد پر پہنچا۔ ان لوگوں نے بغیر چونے اور گارے
کے انہی اینٹوں کو ایک دوسرے پر چننے اور سیاہ پرچم لہرانے
کی کوشش کی[2] تو مجسٹریٹ نے ان نہتھے فوجوں کو جو وہاں پہلے

۱، ۲۔ مفون بعنوان "۱۹۱۳ء میں کانپوری مسجد کی شہادت"، خواجہ
بشیر احمد مطبوعہ روزنامہ "جنگ" کراچی یکم جولائی ۱۹۵۷ء ص ۴

لہ ساب لس فائرنگ کا حکم دے دیا[1] اس دن نمائندہ ہمدرد دہلی نے ایک بیان کے مطابق "سات سو سے اوپر تو صرف گولیاں اور کارتوس ہی استعمال میں لائی گئیں۔ سنگینوں اور بھالوں وغیرہ کا استعمال اس کے علاوہ ہے"[2] اس حادثہ میں بہت بڑی تعداد میں مسلمان ہلاک اور زخمی ہوئے کافی تعداد میں لوگوں کو گرفتار کیا گیا۔ اس حادثہ کے پانچ دن بعد جیمس مسٹن نے کانپور آکر اس خونریزی میں شریک ہونے والے پولیس کے افراد کو اسناد تقسیم کیے[3] گورنر کی اس غیر دانشمندانہ حرکت سے عوام کی بے چینی میں اور اضافہ ہوا۔ اخبارات میں خاص طور پر الہلال (کلکتہ) مسلم گزٹ (لکھنو) کامریڈ (دہلی) ہمدرد (دہلی) اور زمیندار (لاہور) میں اس واقعہ کے خلاف انتہائی پرزور آواز اٹھائی گئی[4] عوام کے زبردست احتجاج کو روکنے کے لیئے حکومت نے

---

[1] A History of FREEDOM MOVEMENT Vol III (1906-1936) Part I Prepared by the Board of Editors Pakistan Historical Society

[2] مضمون بعنوان "1913ء میں کانپوری مسجد کی شہادت" خواجہ بشیر احمد مطبوعہ روزنامہ "جنگ" کراچی یکم جولائی 1957ء ص ۴

[3] بحوالہ "ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں اردو شاعری کا حصہ" ڈاکٹر درخشاں تاجور ص

سا دوبارہ ابھارا۔ ۱۶ اگست کو جب لکھنؤ کے مسلمانوں نے
کانپور کے مظلوموں کی امداد کے لیے فنڈ جمع کرنے کی غرض سے
جلسہ کرنا چاہا تو مجسٹریٹ نے وہاں دفعہ ۱۴۴ نافذ کر کے
اس پر روک لگا دی۔[1] مولانا ابوالکلام آزاد جب حالات
کا جائزہ لینے کے لیے کانپور گئے تو انھیں اسٹیشن ہی پر روک
کر واپس چلے جانے کا حکم دے دیا گیا۔[2] بالآخر جب محمد علی سروزیر
حسن کے ساتھ لندن گئے تو ان کی کوششوں کے نتیجہ میں وزیر ہند
نے وائسرائے کو ہدایت کی کہ مسجد کے شہید حصے کو دوبارہ
بنوا دیا جائے۔[3] اس واقعہ نے مسلمانوں میں انگریزوں سے
نفرت کے جذبات کو اور ہوا دی۔

---

[1] A HISTORY OF FREEDOM MOVEMENT VOL III (1906-1936) PART I PREPARED BY THE BOARD OF EDITORS PAKISTAN HISTORICAL SOCIETY KARACHI PAKISTAN (1961) CHAPTER VI P. 157 (DR. MOINUL HAQ)

[2] مضمون بعنوان "۱۹۱۳ء میں کانپور کی مسجد کی شہادت" خواجہ رشید احمد مطبوعہ روزنامہ "جنگ" کراچی یکم جولائی ۱۹۵۷ء ص ۴

[3] "عہد حاضر کے بڑے لوگ" حصہ اول محمد مرزا دہلوی ص ۴۹

اس طرح ہندوستان میں ایک طرف تو فرقہ واریت کی چنگاریاں اٹھ رہی تھیں تو دوسری طرف قحط، غربت، افلاس اور انگریزی حکومت کی لعنتیں تھیں لیکن اس کے باوجود متوسط طبقہ نے جدید خیالات کو اپنا لیا تھا اور ان کے اندر تنقیدی شعور پیدا ہو گیا تھا۔ متوسط طبقہ کا ارتقاء جمہوری، غیر مذہبی اور قوم پرستانہ بنیادوں پر ہوا تھا۔ . . . . اپنی تمام کمزوریوں کے باوجود متوسط طبقہ نے برٹش اقتدار کے چیلنج کو قبول کیا۔[1] اس چیلنج کے قبول کرنے والوں میں اردو شاعر بھی تھے جن میں اقبال، سرور جہاں آبادی، چکبست، شبلی اور اکبر قابل ذکر ہیں۔ ان کے پیش نظر جدید علوم کی روشنی میں حب وطن کا صحیح شعور بیدار کرنا اور فرقہ واریت کے خلاف جنگ اور جذبہ آزادی کو عام کرنا تھا۔

حالی، آزاد اور اسمٰعیل میرٹھی نے حب وطن کا

---

[1] DR. TARACHAND: HISTORY OF FREEDOM MOVEMENT VOL II 424-25

۱۰ ر ں لکھا اسے اقبال نے اور زیادہ وضاحت کے ساتھ
سں لیا ہے۔ بانگ درا کا آغاز ہی "ہمالہ" سے ہوتا ہے۔ ان
ل شاعری میں جگہ جگہ وطنی اور قومی جذبات کی لہریں
موجزن ہیں۔ "خفتگانِ خاک سے" یہ استفسار کہ

کیا وہاں بجلی بھی ہے، دہقاں بھی ہے، خرمن بھی ہے؟
قافلے والے بھی ہیں، اندیشۂ رہزن بھی ہے؟
واں بھی انساں اپنی اصلیت سے بیگانے ہیں کیا؟
امتیازِ ملت و آئیں کے دیوانے ہیں کیا؟
واں بھی کیا فریاد بلبل پر چمن روتا ہیں؟
اس جہاں کی طرح واں بھی درد دل ہوتا ہیں؟ [1]

ان اشعار سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اقبال کے ہاں وطن کا
جو تصور ہے اس میں نشیب و فراز دونوں موجود ہیں۔

"صدائے درد" میں اپنی سرزمین سے متعلق وہ افسوس
ناک حقیقت کا اظہار یوں کرتے ہیں

سرزمیں اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے

---

[1] "بانگ درا" اقبال ص ۳۸

وصل میں رنج فراق آمیز ہے
مہر بے یک رنگی و بیگانگی ہے غضب
ایک ہی خرمن کے دانوں میں جدائی ہے غضب [1]

"تصویر درد" میں ان تمام کیفیات کا مجموعی اظہار زیادہ دردمندی کے ساتھ پرجوش انداز میں پیش کرتے ہیں۔ اس میں ہندوستان کے پورے دور کی تصویر کشی کرتے ہوئے پیغام نجات بھی دیتے ہیں

رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے ترا ماضی سب زمانوں میں
چھپا کر آستیں میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے
عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں
وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
ذرا دیکھ اس کو جو کچھ ہو رہا ہے ہونے والا ہے
دھرا کیا ہے بھلا عہد کہن کی داستانوں میں

---

[1] "بانگ درا" علامہ اقبال ص ۴۲

"خاموشی کہاں تک؟ لذت فریاد پیدا کر!
زمیں پر تو ہو، اور تیری صدا ہو آسمانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو!
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں" [1]

اس نظم کے متعلق پروفیسر یوسف سلیم چشتی کا بیان حقیقت پر مبنی ہے کہ

"..... اس نظم میں ایک سچے محب
وطن کی مفطر روح آہ و فریاد میں
مصروف نظر آتی ہے اور جو اشعار
اس کے دل کی گہرائیوں سے نکلے ہیں
وہ ہر محب وطن کو متاثر کر دینے
کے لیے کافی ہیں۔" [2]

"ترانہ ہندی" لکھ کر تو اقبال نے اپنی حب الوطنی کو معراج پر پہنچا دیا۔ اس میں اقبال کا جذبہ حب وطن اپنی پوری آب و

[1،2] "بانگ درا" علامہ اقبال مع شرح پروفیسر یوسف سلیم چشتی ص ۱۷۵

اقبال کا یہ ترانہ بچہ بچہ گنگنا رہا ہے وطن کی محبت کے جذبے میں سرشار
اس نظم کا ایک ایک شعر دل کی گہرائیوں میں اترتا چلا جاتا ہے۔
اقبال کی حب الوطنی کی عکاسی یہ نظم ملاحظہ ہو

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں
سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا
پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا
وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا
گودی میں کھیلتی ہیں اس کی ہزاروں ندیاں
گلشن ہے جن کے دم سے رشک جناں ہمارا
اے آب رود گنگا وہ دن ہیں یاد تجھ کو
اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا
یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے

اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا
کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا
اقبالؔ کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا [1]

"ہندوستانی بچوں کا قومی گیت" میں اقبالؔ نے ہندوستان کے پورے تاریخی شعور کے ساتھ اپنی حب الوطنی کا اظہار کیا ہے۔

چشتی نے جس زمیں میں پیغامِ حق سنایا
نانکؔ نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا
جس نے حجازیوں سے دشتِ عرب چھڑایا
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

یونانیوں کو جس نے حیران کر دیا تھا
سارے جہاں کو جس نے علم و ہنر دیا تھا
مٹی کو جس کی حق نے زر کا اثر دیا تھا

---

[1] "بانگ درا" علامہ اقبالؔ ص ۸۳

سرکوں کا جس نے دامن ہیروں سے بھر دیا تھا

میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے[1]

"نیا شوالہ" میں تو اقبالؔ کو خاک وطن کے ذرات بھی دیوتا نظر آتے ہیں۔

سچ کہہ دوں اے برہمن! گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا
جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے
تنگ آ کے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا
واعظ کا وعظ چھوڑا، چھوڑے ترے فسانے
پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے[2]

مارچ ۱۹۰۷ء میں انھوں نے ایک غزل نما نظم لکھی جس میں اہل مغرب کو للکارا۔

---

[1] "بانگ درا" علامہ اقبالؔ ص ۸۷

[2] "بانگ درا" علامہ اقبالؔ ص ۸۸

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائیدار ہوگا
خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا [1]

لیکن ۱۹۰۸ء کے بعد سے ان کے تصورات میں تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ اپنی نظم "وطنیت" میں انھوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور
ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے
ہو قید مقامی تو نتیجہ ہے تباہی

---

[1] "بانگِ درا" علامہ اقبال ص ۱۸۰

وہ کفر ہے اداد وطن صورت ماہی
ہے حب وطن سنت محبوب الٰہی
دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی
گفتار سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشاد نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

اقوام جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے
تسخیر ہے مقصود تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے
کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے
اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے
قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے[1]

اور پھر "ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا" کے بجائے اقبال نے "مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا" کا ترانہ چھیڑ دیا۔ اقبال کے خیال میں وطن کا سیاسی تصور مخلوق خدا کے درمیان تفرقہ اندازی ہے۔ وہ کہتے ہیں

---

[1] "بانگ درا" علامہ اقبال ص ۱۶۰

"اگر قومیت کے معنی حب الوطنی اور ناموس
وطن کے لیے جان تک قربان کرنے کے ہیں تو
ایسی قومیت مسلمانوں کے ایمان کا جزو ہے
اس قومیت کا اسلام سے اس وقت تصادم
ہوتا ہے جب وہ ایک سیاسی تصور کا کردار
ادا کرنا شروع کر دیتی ہے۔" [1]

اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اقبال نے وطنیت کے خلاف جو تصور پیش کیا تھا وہ اس جارحانہ قوم پرستی کے خلاف تھا جو مخلوق خدا کو اقوام میں تقسیم کر کے اسے خوں ریزی کی تعلیم دیتا ہے۔ مارچ ۱۹۳۸ء یعنی وفات سے ایک ماہ پہلے انھوں نے اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا۔

"..... وطن محض ایک جغرافیائی اصطلاح ہے
اور اس حیثیت سے اسلام سے متصادم نہیں ہوتا۔
ان معنوں میں ہر انسان فطری طور پر اپنے جنم
بھوم سے محبت رکھتا ہے اور بقدر اپنی بساط

---

[1] "مضامین اقبال" ص ۱۷۰

لے اس لیے قربانی کرنے کو تیار رہتا ہے

مگر زمانہ حال کے سیاسی لٹریچر میں "وطن"

کا مفہوم محض جغرافیائی نہیں بلکہ "وطن" ایک

اصول ہے ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کا۔ اور اسی

اعتبار سے ایک سیاسی تصور ہے چونکہ اسلام

بھی ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کا قائل ہے اس

لیے جب لفظ "وطن" کو ایک سیاسی تصور کے

طور پر استعمال کیا جائے تو وہ اسلام سے مقدم

ہوتا ہے۔" [1]

اپنے آخری دور میں یعنی ۱۹۳۰ء کے بعد سے ان کے خیالات میں پھر تبدیلی آئی۔ انھوں نے پھر مسلمانوں کے محدود تصور کے بجائے پورے ہندوستان کو اپنی فکر کا محور بنالیا۔ جس میں کچھ اشتراکیت کا اثر بھی نظر آتا ہے۔ وہ کہتے ہیں

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو

کاخ امرا کے در و دیوار ہلا دو

---

[1] "نقوش اقبال"۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ص ۳۰۹

کر ماؤ غلاموں کا لہو سوز یقیں سے
کنجشک فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقش کہن تم کو نظر آئے مٹا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو [1]

اس نظم کے علاوہ بھی ان کے آخری دور کی نظموں میں حب الوطنی کا درد، کسک اور کرب بہت نمایاں ہے۔ ملاحظہ ہو

معلوم کسے ہند کی تقدیر کہ اب تک
بے چارا کسی تاج کا تابندہ نگیں ہے
دہقاں ہے کسی قبر سے نکلا ہوا مردہ
بوسیدہ کفن جس کا ابھی زیر زمیں ہے
یورپ کی غلامی پہ رضامند ہوا تو
مجھ کو تو گلا تجھ سے ہے یورپ سے نہیں ہے [2]

---

[1] "بال جبریل" علامہ اقبال ص ۱۰۹

[2] بحوالہ "اردو شاعری میں قومی یکجہتی کے عناصر" ڈاکٹر مجاور حسین رضوی ص ۳۵۳

سنہ ۳۵ء کے ایکٹ پر ان کا شعری تبصرہ نہ صرف یہ کہ انگریزوں کے خلاف ہے بلکہ حاکمی نفسیات اور محکومی کے تصورات کی نمائندگی بھی اس میں نظر آتی ہے۔ کہتے ہیں

یہ مہر بے مہری صیاد کا پردہ
آئی نہ میرے کام میری تازہ صفیری
رکھنے لگا سر جھائے ہوئے پھول قفس میں
شاید کہ اسیروں کو گوارا ہو اسیری! [1]

ان سب سے بالاتر ان کی معرکہ خیز نظم "شعاع امید" ہے جس کا آخری بند درج کیا جاتا ہے۔

اک شوخ کرن، شوخ مثال نگہ حور
آرام سے فارغ صفت جوہر سیماب!
بولی کہ مجھے رخصت تنویر عطا ہو
جب تک نہ ہو مشرق کا ہر اک ذرہ جہاں تاب
چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو
جب تک نہ اٹھیں خواب سے مردان گراں خواب!

---

[1] "کلیات اقبال" ص ۶۲۳

خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز
اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب!
چشم مہ و پروین ہے اسی خاک سے روشن
یہ خاک کہ ہے جس کا خزف ریزہ دُر ناب
اس خاک سے اٹھے ہیں وہ غواص معانی
جن کے لیئے ہر بحر پُر آشوب ہے پایاب
جس ساز کے نغموں سے حرارت تھی دلوں میں
محفل کا وہی ساز ہے بیگانۂ مضراب
بت خانہ کے دروازے پہ سوتا ہے برہمن
تقدیر کو روتا ہے مسلماں تہ محراب!
مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر! [1]

سرور جہاں آبادی کی شاعری کا آغاز بھی انیسویں صدی کے اواخر سے ہوتا ہے۔ ان کی شاعری کے بارے میں عبدالقادر سروری لکھتے ہیں۔

---

[1] "کلیات اقبال" ص ۵۷۱

"سرور کی شاعری کی اصل اہمیت یہ ہے
کہ وہ حقیقی ہندوستانی شاعری معلوم ہوتی
ہے..... سرور میں شاعرانہ تنگ
خیالی یا مذہبی تعصب نام کو نہیں تھا۔" [1]

حب الوطنی کا تصور ان کی شاعری میں بہ اثر انداز میں نظر آتا ہے۔ وہ ہندو اور مسلمان دونوں کو حب الوطنی کی پرخلوص ترغیب دیتے ہیں۔

دل سرد ہیں رگوں میں گویا لہو نہیں ہے
حب وطن کی ہم میں وہ آہ و ہو نہیں ہے
وہ ولولے نہیں ہیں وہ آرزو نہیں ہے
گویا رہ طلب میں وہ جستجو نہیں ہے
پروانوں کا تجھے غم اے شمع انجمن ہے
قسمت میں آہ میری دلسوزی وطن ہے

"گلزار وطن" میں کہتے ہیں

پھولوں کا کنج دلکش بھارت میں اک بنائیں

---

[1] "جدید اردو شاعری" عبدالقادر سروری ص ۲۶۱

حب وطن کے پودے اس میں نئے لگائیں
ایک ایک گل میں پھونکیں روح شمیم وحدت
اک اک ملی کے دل کے دامن سے دیں ہوائیں
مرغان باغ بن کر اڑتے پھریں ہوا میں
نغمے ہوں روح افزا اور دل ربا صدائیں
چھائی ہوئی گھٹا ہو موسم طرب فضا ہو
پھونکے چلیں ہوا کے، اشجار لہلہائیں

اس کنج دل نشیں میں قبضہ نہ ہو خزاں کا
جو ہو گلوں کا تختہ، تختہ ہو اک جناں کا
بلبل کو ہو چمن میں صیاد کا نہ کھٹکا
خوش خوش ہو شاخ گل پر، غم ہو نہ آشیاں کا
موسم ہو جوش گل کا اور دن بہار کے ہوں
عالم عجیب دل کش ہو اپنے گلستاں کا
مل مل کے ہم ترانے حب وطن کے گائیں
بلبل ہیں جس چمن کے یہ گیت اس چمن کے گائیں[1]

---

[1] "خلکدہ سرور" مرتبہ قاضی محمد غوث فضا حیدرآبادی ص ۱۵۶

ڈاکٹر حکم چند نیّر مجموعے کے پیش لفظ میں اس نظم کے بارے میں لکھتے ہیں

"سرور کا اجتماعی شعور اور سماجی احساس بالیدہ تھا۔ وہ انفرادیت سے نکل کر اجتماعی زندگی کے دائرے میں داخل ہو چکے تھے۔ ماضی کے وسیع تاریخی مطالعے اور حال کے مشاہدے سے سرور نے مستقبل کا ادراک حاصل کر کے نصف صدی پہلے اپنی نظم "پھولوں کا کنج" میں ایک ایسے ہندوستان کا تصور پیش کر دیا تھا جس میں گلچیں کا ڈر ہوگا نہ صیاد کا کھٹکا۔ امن و امان، خوشحالی، اتفاق و اتحاد کا دور دورہ ہوگا۔ رنگ و نسل کے نام پر ہونے والے فسادات ختم ہو جائیں گے۔ جلوۂ صد رنگ میں ہم رنگی و یکجہتی ملے گی..... آزاد ہندوستان کا اس سے بہتر تصور ہمارے رہنماؤں کے پاس بھی نہ تھا۔" [1]

---

[1] "نوائے سرور" پیش لفظ ڈاکٹر حکم چند نیّر ص ۲۵

• رلو انقلابات زمانہ کا شدید احساس تھا انھیں اپنے وطن کے ماضی اور حال کا فرق معلوم تھا اس لیئے ان کی شاعری میں ماضی کی محبت اور حال سے مایوسی اور اس کی محکومی کا انداز جھلکتا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

ہم ستائے ہوئے ہیں گردش ایام کے آہ
ہم کو یاروں سے نہیں شکوہ بیداد وطن
گیت گاتے تھے کبھی حب وطن کے ہم بھی
وہ بھی دن تھے کہ چمن میں تھے ہم آزاد وطن
رحم کر رحم کر صیاد قفس میں افسوس
چہچہاتا کب سے ہے اک مرغ چمن زار وطن [1]

سرور چاہتے تھے کہ ہندوستان میں شعور و احساس پیدا ہو جائے اور وہ بھی دوسری قوموں کی طرح ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکیں۔

خواب گراں سے چونکو ہندوستان والو
پستی میں کیوں پڑے ہو اونچے نشان والو

---

[1] "مخلدہ سرور" مرتبہ قاضی محمد غوث فضا حیدرآبادی ص ۸۲

لب تک یہ آہ ذلت اوعزو شان والو
کب تک یہ خواب غفلت سونے کی مان والو
اُٹھ کر ذرا تو دیکھو دنیا کا رنگ کیا ہے
رفتار کیا جہاں کی قوموں کا ڈھنگ کیا ہے
ہے حفظ و فع کیا شئے ناموس و ننگ کیا ہے
ایثار نفس کیا ہے قومی اُمنگ کیا ہے
قوموں کی ہے ترقی کا کچھ تو راز آخر
حب وطن میں کر دو دل کو گداز آخر [1]

"عروس حب وطن" میں کہتے ہیں

آ، اے عروس حب وطن! میرے بر میں تو
آنکھیں تری تلاش میں ہیں محو جستجو
حوروں پہ میں مروں تو جہنم نصیب ہو
کافر ہوں میں جو تجھ کو بتوں کی ہو آرزو
ناقوس اور اذاں میں ہیں قید کفر و دیں
ان کے لیئے کہ جن کا پرستش کدہ ہے تو

---

[1] "مخزنہ سرود" مرتبہ قاضی محمد غوث فضا حیدرآبادی ص ۶۷

لنگا لہائے شیخ، اگر تیرا اذن ہو
تیرا اشارہ ہو تو برہمن کرے وضو [1]

بقول ڈاکٹر مجاور حسین رضوی حب وطن کا یہ صحیح تصور ہے جو "جہ زمزم میں لنگا کا پانی" ملا دینے کے تصور کا حقیقی وارث ہے جس کی نظیر ہندوستان کی کسی اور زبان کی شاعری میں نہ مل سکے گی [2]

سرور کہتے ہیں کہ جس کے دل میں حب وطن نہ ہو وہ انسان "پارہ سنگ" سے بھی زیادہ بے حقیقت ہے۔ "نیرنگ زمانہ" کا یہ شعر اسی طرف اشارہ کرتا ہے۔

سرور جس میں نہ حب وطن کا ہو احساس
وہ دل ہو چور کہ بہتر ہے اس سے پارۂ سنگ [3]

اہل ہند کو نشہ حب وطن سے مخمور کرنے کی کوشش انھوں نے اپنی نظم "سال نو اور ہندوستان" میں بھی کی جسے انھوں نے اقبال کی نظم "ہندوستاں ہمارا" کے تتبع لکھا [4]۔ نظم کے چند شعر ملاحظہ ہوں

---

[1] "خمکدۂ سرور" مرتبہ قاضی محمد غوث فضا حیدرآبادی ص ۱۰۴

[2] "اردو شاعری میں قومی یکجہتی کے عناصر" ڈاکٹر مجاور حسین رضوی ص ۳۵۷

[3] "خمکدۂ سرور" مرتبہ قاضی محمد غوث فضا حیدرآبادی ص ۲۷۲

[4] "درگا سہائے سرور جہان آبادی حیات و شاعری" باوا کرشن گوپال مخموم ص ۷۸

ہو بزم سال نو میں ہم داستاں ہمارا
آ مل کے گائیں مطرب ہندوستاں ہمارا
ہندوستاں کے ہم ہیں ہندوستاں ہمارا
قالب ہے یہ ہمارا روح رواں ہمارا

. . . . . .

حب وطن کی مے کا ہو کیف چشم دل میں
ہو دور جام ساقی! دور جہاں ہمارا [1]

حب الوطنی سے سرشار ہو کر سرور نے جتنی بھی نظمیں کہی ہیں اس میں جذبہ حب الوطنی کو پروان چڑھانے کی شدید خواہش کا اظہار ملتا ہے۔ اس کے لیے انھوں نے کبھی براہ راست اور کبھی بالواسطہ مخاطب کیا ہے۔ "بلبل اور میں" اور "شمع اور انجن" اس کی بہترین مثالیں ہیں۔

"بلبل اور مئی" میں کہتے ہیں

بتلا میں غم کا ہوں تو تصویر ہے محن کی
ارماں مجھے وطن کا حسرت تجھے چمن کی

---

[1] "مخزنہ سرور" مرتبہ قاضی محمد غوث فضا حیدرآبادی ص ۱۰۷

حسرت بھری صدا ہے مجھ زار و خستہ تن کی
مئے غم فزا ہے تری فریاد جاں شکن کی

قید جفا میں تو ہے زنداں میں میہماں ہوں
تو نالہ گوش ہے میں منت کش فغاں ہوں

محو خیال گل تو، میں محو دوستاں ہوں
فرقت نصیب تو، میں بے یار و خانماں ہوں

تو مرغ خستہ جاں ہے میں زار و ناتواں ہوں
تو آہ! مشت پر ہے میں منت استخواں ہوں

بے چین کر رہی ہے خواہش تجھے چمن کی
اور خوں رلا رہی ہے حسرت مجھے وطن کی

جب وطن کے نغمے گاؤں میں پھر وطن میں
چھیڑوں نئے ترانے یاروں کی انجمن میں

اک عمر آہ! گذری قید غم و محن میں
آزاد میں وطن میں، تو شاد ہو چمن میں

محو نثار گل ہو تو شاخ آشیاں پر
ہوں الفت وطن کے نغمے میری زباں پر[1]

---

[1] "خلدہ سرود" مرتبہ قاضی محمد غوث فضا حیدرآبادی ص ۱۴۱-۱۴۲

"شمع اور انجمن" کے بند ملاحظہ ہوں۔

دانوں کو جس طرح تو جلتی ہے انجمن میں
جلتا ہوں میں بھی یوں ہی سوز غم وطن میں
لپٹے ہوئے ہیں شعلے دونوں کے پیرہن میں
آتش بجاں ہیں دونوں اس محفل کہن میں
یعنی گداز الفت دونوں کے ہے دلوں میں
دونوں کی روشنی ہے دنیا کی محفلوں میں

سینے میں آہ تیرے سوز غم و محن ہے
داغوں کا اک شگفتہ دل میں مرے چمن ہے
پروانوں کا تجھے غم اے شمع انجمن ہے
قسمت میں آہ میری دلسوزی وطن ہے
جلتا ہوں سوز غم سے میں وہ مناطلب ہوں
ہوں آگ پر لپکتا، وہ کبک مضطرب ہوں[1]

ان کی ایک اثر انگیز نظم "قومی نوحہ" ہے جس میں انھوں نے ہندوستان کی عظمت و شوکت کے مٹنے اور جذبہ حب الوطنی

---

[1] "خلدہ سرور" مرتبہ قاضی محمد غوث فضا حیدرآبادی ص ۱۲۷

لیالی پر رنج و غم کا اظہار کرنے کے بعد اپنی اس خواہش
کا اظہار کیا ہے کہ ایک مرتبہ پھر ہندوستان کی شان و شوکت
لوٹ آئے اور وہ جنت نشان بن جائے۔

دل سرد ہیں رگوں میں گویا لہو نہیں ہے
حب وطن کی ہم میں وہ آہ! بو نہیں ہے
وہ ولولے نہیں ہیں وہ آرزو نہیں ہے
گم ہیں رہ طلب میں وہ جستجو نہیں ہے
گم کردہ کارواں ہیں جو میر کارواں تھے
بے نام و بے نشاں ہیں جو صاحب نشاں تھے

زاغ و زغن کا مسکن ہے آہ! اب چمن میں
دھندلی سی شمع ہے اب یاروں کی انجمن میں
پتلا ہے بیکسی کا لپٹا ہوا کفن میں
اڑتی ہے خاک حسرت اب کو بکو وطن میں
کیا وطن! وطن کا اک نام رہ گیا ہے
اس میکدہ میں باقی اک جام رہ گیا ہے

جوہر وہی ہیں تجھ میں کیا او! وطن کی مٹی

رنگیں ہے اب بھی خوں سے کیا تو چمن کی مٹی
برباد ہو رہی ہے بزم کہن کی مٹی
یادوں کی خاک اگلے دے او الجھن کی مٹی

نقشہ وہی نظر میں کھنچ جائے پھر وطن کا
پھر رنگ روپ نکھرے آجڑے ہوئے چمن کا

بام فلک سے اونچا ہو پھر نشاں ہمارا
سارے جہاں میں ہم ہوں سارا جہاں ہمارا
عرش بریں کا زینہ ہو آسماں ہمارا
جنت نشاں بنے پھر ہندوستاں ہمارا

پھوٹیں نئے شگوفے پھر نخل آرزو کے
گرمی بڑھے دلوں میں سرعت بڑھے لہو میں[1]

چکبست کی شاعری بھی اپنے زمانے کے اہم سیاسی و سماجی حالات و واقعات کی آئینہ دار ہے۔ سرور کی طرح ان کو بھی حب وطن کے فقدان کا احساس تھا اس لیئے وہ ضرور حب قومی سے خوابیدہ قوم کو بیدار کرنا چاہتے ہیں۔

---

[1] "نغمۂ سرور" مرتبہ حافی محمد غوث فضا حیدرآبادی ص ۲۷۸-۲۷۹

"خاک ہند" کے کچھ بند ملاحظہ ہوں۔

اگلی سی تازگی ہے پھولوں میں اور پھلوں میں
کرتے ہیں رقص اب تک طاؤس جنگلوں میں
اب تک وہی کڑک ہے بجلی کی بادلوں میں
بستی سی آگئی ہے پر دل کے حوصلوں میں
گل شمع انجمن ہے گو انجمن وہی ہے
حب وطن نہیں ہے خاک وطن وہی ہے

ہر سو سے ہو رہا ہے ہر دم سماں ہمارا
دنیا سے مٹ رہا ہے نام و نشاں ہمارا
کچھ کم نہیں اجل سے خواب گراں ہمارا
اک لاش بے کفن ہے ہندوستاں ہمارا
علم و کمال و ایماں برباد ہو رہے ہیں
عیش و طرب کے بندے غفلت میں سو رہے ہیں

اے صور حب قومی اس خواب سے جگا دے
بھولا ہوا فسانہ کانوں کو پھر سنا دے
مردہ طبیعتوں کی افسردگی مٹا دے

اُٹھتے ہوئے شرارے اس راکھ سے دکھا دے

جب وطن سمائے آنکھوں میں نور ہو کر
سر میں خمار ہو کر دل میں سرور ہو کر[1]

۱۸۵۷ء کے ہنگامے نے اگر ایک طرف ہندوستانی حکومت کا خاتمہ کر دیا تو دوسری طرف ادیبوں میں یہ شعور پیدا کر دیا کہ وہ شاعری کو زندگی سے قریب تر لانے کی کوشش کریں۔ حالات کے بدل جانے کی وجہ سے قومی اور ملکی تصور دلوں میں بیدار ہونے لگا۔ اس قومی تصور نے آگے چل کر وطنی بیداری کا احساس پیدا کر دیا۔ چکبست ذہنی اعتبار سے اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ جیسا کہ احتشام حسین فرماتے ہیں

"ان کا دور وہی قومی اور وطنی بیداری کے احساس کا دور ہے جو غدر کے کچھ عرصہ بعد کانگریس کا بیس بدل کر اٹھا اور آہستہ آہستہ اپنے چہرے سے نقاب ہٹاتا گیا۔ انیسویں صدی جاتے جاتے ہمیں ایک مبہم

---

[1] "صبح وطن" چکبست لکھنوی ص ۳۱-۳۲

ساتویں نقود دیتی گئی اور چکبست

اس دور کی پیداوار ہیں۔" [1]

ان کی غزلوں میں بھی حب الوطنی کا رنگ جھلکتا ہے۔ غزلوں کے چند شعر پیش ہیں۔

جنون حب وطن کا مزا شباب میں ہے　　لہو میں پھر یہ روانی رہے رہے نہ رہے
مٹا رہا ہے زمانہ وطن کے مندر کو　　یہ مرمٹوں کی نشانی رہے رہے نہ رہے
جو مانگنا ہو ابھی مانگ لو وطن کے لیے　　یہ آرزو کی جوانی رہے رہے نہ رہے

. . . . . .

کبھی تھا ناز زمانے کو اپنے ہند پہ بھی　　پر اب عروج وہ علم و کمال فن میں نہیں
غرور جہل نے ہندوستاں کو لوٹ لیا　　بجز نفاق کے اب خاک بھی وطن میں نہیں [2]

. . . . . .

خاک وطن میں دامن مادر کا چین ہے　　تنگی کنار کی ہے لحد کا فشار کیا [3]

---

[1] "تنقیدی جائزے" پروفیسر احتشام حسین ص ۱۲۲

[2] "چکبست حیات اور ادبی خدمات" ڈاکٹر افضال احمد ص ۱۳۸-۱۳۹

[3] "صبح وطن" چکبست لکھنوی ص ۱۵۵

اس طرح چکبست کا سیاسی شعور جس میں حب وطن، آزادی رائے، قومی اتحاد اور ایک محدود قسم کے جذبہ آزادی کی آمیزش ہے شاعری کے پردے میں ظاہر ہو کر اردو شاعری کا ایک اہم اور عزیز سرمایہ بن گیا۔

اسی دور کے ایک اور شاعر مولانا شبلی بھی ہیں ان کی حب الوطنی اس بات سے ظاہر ہوتی ہے کہ وہ پکے قوم پرست ہوتے ہوئے بھی مسلم لیگ کو ملک و قوم کے مفاد میں مناسب نہیں سمجھا۔ لکھتے ہیں

لیگ کی عظمت و جبروت سے انکار نہیں
ملک میں غلغلہ ہے شور ہے کہرام بھی ہے
ہے گورنمنٹ کی بھی اس پہ عنایت کی نگاہ
نظر لطف رئیسان خوش انجام بھی ہے
ربط ہے اس کو گورنمنٹ سے بھی ملک سے بھی
جس طرح "صرف" میں ایک قاعدہ ادغام بھی ہے
مجھ سے آہستہ مرے کان میں ارشاد ہوا یہ
"سال بر حضرت والا کوئی کام بھی ہے" [1]

---

[1] "اردو میں قومی شاعری کے سو سال" مرتبہ علی جواد زیدی ص ۱۴۳

"پہلی جنگ عظیم اور ہندوستانی" میں ان کی حب الوطنی ملاحظہ ہو۔

اک جرمنی نے مجھ سے کہا از رہ غرور
آساں نہیں ہے فتح تو دشوار بھی نہیں
برطانیہ کی فوج ہے دس لاکھ سے بھی کم
اور اس پہ طرفہ یہ ہے کہ تیار بھی نہیں
باقی رہا فرانس تو وہ زندہ لم یزل
آئیں شناس شیوۂ پیکار بھی نہیں
میں نے کہا غلط ہے ترا دعوئے غرور
دیوانہ تو نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں
ہم لوگ اہل ہند ہیں جرمن سے دس گنے
تجھ کو تمیز اندک و بسیار بھی نہیں
سنتا رہا وہ غور سے میرا کلام اور
پھر وہ کہا جو لائق اظہار بھی نہیں
"اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں"۔ [1]

---

[1] "کلیات شبلی" شبلی ص ۱۰۷ - ۱۰۸

اس دور میں حسرت موہانی کی شاعری بھی نمایاں اہمیت رکھتی ہے۔ ان کے کلام میں سیاسی جبر، محکومی اور غلامی کا شدید احساس پایا جاتا ہے۔

اچھا ہے اہلِ جور کیے جائیں سختیاں
پھیلے گی یونہی شورشِ حب وطن تمام
سمجھے ہیں اہلِ شوق کو شاید قریبِ مرگ
مغرب کے یوں ہیں جمع یہ زاغ و زغن تمام [1]

رسم و فا کامیاب دیکھیے کب تک رہے
حب وطن محو خواب دیکھیے کب تک رہے
تابکجا ہوں دراز سلسلہ ہائے فریب
ضبط کی لوگوں میں تاب دیکھیے کب تک رہے
نام سے قانون کے ہوتے ہیں کیا کیا ستم
جبر بنر یر نقاب دیکھیے کب تک رہے

دولتِ ہندوستاں قبضۂ اغیار میں
بے حدود و بے حساب دیکھیے کب تک رہے

---

[1] "کلیاتِ حسرت موہانی" حسرت موہانی۔ ص ۱۳۷

حسرتؔ آزاد پر جور غلامانِ وقت
از رہِ لطف و عتاب دیکھیے کب تک رہے [1]

حسرتؔ نے اپنے رسالے اردوئے معلیٰ کے ذریعہ اپنے خیالات کا اظہار بے باکانہ انداز سے کیا۔ اپریل ۱۹۰۸ء میں ایک مضمون کی اشاعت پر انھیں پہلی بار دو سال قید کی سزا ہوئی۔ اس قید کے کلام کی ایک جھلک "چکی کی مشقت" ہے۔

ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرتؔ کی طبیعت بھی
جو چاہو سزا دے لو تم اور بھی کھل کھیلو
پر ہم سے قسم لے لو کی ہو جو شکایت بھی
اے شوق کی بے باکی وہ کیا تری خواہش تھی
جس پر انھیں غصہ ہے انکار بھی حیرت بھی
ہر چند ہے دل شیدا خو یتِ کامل کا
منظور دعا لیکن ہے قید محبت بھی [2]

---

[1] "کلیاتِ حسرتؔ موہانی" حسرتؔ موہانی ص ۱۳۸

[2] "کلیاتِ حسرتؔ موہانی" حسرتؔ موہانی ص ۱۶۰

ان کی شاعری میں عمل کا پیغام بھی ہے۔ وہ اہل وطن کو حصول آزادی کے لیئے متحد اور منظم ہونے کی ترغیب دیتے ہیں۔

غضب ہے کہ پابند اغیار ہو کر
مسلمان رہ جائیں یوں خوار ہو کر
سمجھتے ہیں سب اہل مغرب کی چالیں
مگر پھر بھی بیٹھے ہیں بیمار ہو کر
ابھی ہم کو سمجھے نہیں اہل مغرب
بتا دو انھیں گرم پیکار ہو کر
فریب و دغا کے مقابل میں تم بھی
نکل آؤ بے رحم و خونخوار ہو کر
کہیں صلح و نرمی سے رہ جائے دیکھو
نہ یہ عقدۂ جنگ دشوار ہو کر
تقاضائے غیرت یہی ہے عزیزو
کہ ہم بھی رہیں ان سے بیزار ہو کر [1]

---

[1] "تحریک آزادی میں اردو کا حصہ" ڈاکٹر معین عقیل ص ۱۳۴

اس دور میں دو تحریکیں چل رہی تھیں۔ (۱) فرقہ پرست تحریک (۲) قوم پرست تحریک۔ ان میں سے ہر شاعر نے قوم پرستانہ تحریک سے اپنے کو وابستہ کیا اور فرقہ پرست تحریک کی مخالفت کی اس طرح حب الوطنی کے جذبہ کو تقویت ملتی رہی۔

اس دور میں حب الوطنی بھی دو صورتوں میں جلوہ گر رہی۔ کچھ شاعروں نے اسے مجرد شکل میں پیش کیا تو کسی نے انگریزوں اور انگریزی تہذیب سے نفرت اور غلامی سے چھٹکارا پانے کی تمنا کے ذریعہ اسے پیش کیا۔ ان ہی میں اکبر بھی ہیں۔

اکبر نے اپنے مخصوص ظریفانہ انداز میں سیاسی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ اپنے معاشرے کے گرد و پیش کے حالات کا ایک مفکر شاعر اور بے لاگ نقاد کی حیثیت سے جائزہ لے رہے تھے۔ مسلمانوں کی پسماندہ اور الم انگیز حالت ان کے پیش نظر تھی۔ قدیم طرز معاشرت اور تہذیبی روایات کے زوال کا صدمہ تھا۔ وہ ہندوستانیوں کے احساس مرعوبیت پر

متاسف تھے۔

ہرگز نہیں ہم کو سلطنت کا افسوس
ہے ابتری معاشرت کا افسوس
انگریزوں پہ ہے بہت کم الزام اس کا
ہے اپنے ہی سیل معصیت کا افسوس [1]

برطانوی حکومت اور اس کے اقتدار کے نتائج کے بارے میں اکبر کے احساسات ملاحظہ ہوں۔

تم نے دباد باکر اس ملک کو کھلایا

مرزا پچک گئے اور گاندھی نے منہ پھلایا
فخر تھا اپنی چمک پر آپ کو
دو ہی صدیوں میں ملمع کھل گیا
بلبلا اٹھی رعایا ہر طرف
عرش و کرسی تک فغاں کا غل گیا
بھاگ نکلے لوگ ہو کر بے قرار
کوئی امریکہ کوئی کابل گیا [2]

---

[1] "تحریک آزادی میں اردو کا حصہ" ڈاکٹر محی الدین عقیل ص ۱۰۱م
[2] "تحریک آزادی میں اردو کا حصہ" ڈاکٹر محی الدین عقیل ص ۳۰م

جلیان والا باغ کے خونیں واقعہ کا اکبرؔ کے حساس اور دردمند دل پر بہت اثر پڑا۔ وہ گھبرا کر مشورہ دیتے ہیں

پالیٹکسی جھگڑے چھوڑو ان باتوں سے اب منہ موڑو
کیسے ڈائر کیسے سنٹر لاؤ ساغر لاؤ کنٹر [1]

کبھی کہتے ہیں

زباں بند ہے اس عہد پر فغاں کے بعد
سکوت ہی مجھے رہنا ہے اب تو آہ کے بعد

وہ گاندھی جی کے ہمت و حوصلہ کے معترف بھی نظر آتے ہیں۔

قرائن کہہ رہے ہیں آرہا ہے دور فتنوں کا
ہوائیں وہ چلیں گی نقش مٹ جائے گا کتنوں کا
کمی کی چل سکے گی کیا اگر قرب قیامت ہے
مگر اس وقت ادھر چرخہ اُدھر ان کی وزارت ہے [2]

ان کی حب الوطنی میں جو مقصدی شعور کارفرما تھا وہ یہ تھا کہ مغربی تہذیب کے اثر سے قدیم تہذیب کا شیرازہ بکھر جانے کا ڈر تھا۔

[1,2] "اکبرؔ کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ"، ڈاکٹر صفر امہدی ص ۴۹۔۵۰

معنی میں بھی ہو جائے گا آخر کو تغیر
تبدیلی صورت کے رہے گر یہی آثار
بیگانہ وشی ہوگی عزیزان وطن سے
بنگلے میں نہاں ہوں گے کہیں چھوڑ کے گھر بار
آپس میں بھی تم لوگ موافق نہ رہو گے
ایک ایک کو دیکھے گا بہ اکراہ و بہ انکار

اس طرح بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں شاعری نے اہل ملک کے دلوں میں وطنیت کے جذبات کو ابھارا اور غیر ملکی سامراج سے برسرپیکار ہونے کا حوصلہ عطا کیا۔ انگریزی حکمرانوں کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کی ترغیب دلائی۔ اردو شعرا نے بڑے جرأت مندانہ اور بے باکانہ انداز میں غیر ملکی اقتدار کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور اہل وطن میں وطن پرستی اور حب الوطنی کے جذبہ کو فروغ دیا۔ انھیں غلامی اور محکومی کا احساس دلایا ان میں جذبہ آزادی کی جوت جگائی۔ اس طرح اردو شعرا نے اس عرصہ میں عوام کے خوابیدہ سیاسی شعور کو بیدار کر کے انھیں غلامی کی زنجیروں کو توڑنے پر آمادہ کیا اور جدوجہد آزادی کے قافلے کو آگے بڑھایا۔

پانچواں باب

ہندوستان کی جدوجہد آزادی اور حب الوطنی

افلاطون نے اپنی ریاست سے شعراء کو اس
لیئے خارج کر دیا تھا کہ وہ اشتعال کا سبب بن سکتے تھے۔ افلاطون
کو یہ اندازہ تھا کہ شعراء اپنی گرم گفتاری اور جذبہ کی تپش سے
اہل وطن کے ذہن کو مجوزہ ریاست کے خلاف بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن
اسی کے عزیز شاگرد ارسطو نے شاعروں کو ایک ضروری عنصر
قرار دیا۔ ہندوستان کے دانشوروں اور خصوصاً اردو تنقید
کے باوا آدم مولانا الطاف حسین حالی نے بھی اس بات کو محسوس
کر لیا تھا کہ شاعری سے بڑے بڑے کام لیئے جا سکتے ہیں۔ انھیں
اندازہ تھا کہ یورپ میں جب سیاسی انقلاب پھل ہوئی تو شاعری
نے قوم کے مزاج کو بدلنے کے لیئے ایک بہت اہم کردار ادا کیا
تھا۔ حالی اپنی کتاب مقدمہ شعر و شاعری میں ایتھنز کے
ایک مشہور ماہر قانون سولن کی مثال دیتے ہیں جس نے اپنے
درد انگیز اشعار کے ذریعہ اہل وطن کو انتقام پر آمادہ کیا تھا
اور ایتھنز والوں نے جذبہ حب الوطنی سے سرشار ہو کر اپنا
چھینا ہوا ملک حاصل کر لیا تھا۔ انھوں نے دوسری مثال انگلستان

کی تاریخ سے دی ہے کہ جب 'اڈورڈ' نے ویلز پر چڑھائی کی تو ویلز کے شعراء نے نہایت ولولہ انگیز شعر کہے اور فوجی طاقت کے اعتبار سے کمزور ہونے کے باوجود محض حب الوطنی کے جذبہ سے سرشار ہو کر انگلستان کی فوج کے آگے ڈٹ گئے اور تا مرگ اطاعت قبول نہ کی۔

حالی نے ایک اور مثال فرانس کی دی ہے کہ ۱۸۳۵ء میں چارلس دہم نے قانون آزادی کے خلاف کارروائی شروع کی اور فرانس کے عوام میں اضطراب کی کیفیت پیدا ہوئی اس وقت دو قصیدے لکھے گئے تھے جن سے لوگوں میں بادشاہ کے خلاف بغاوت کا جذبہ بھڑکایا گیا تھا۔

گذشتہ ابواب میں ہندوستان کی جنگ آزادی کے ضمن میں کچھ باتیں لکھی گئیں۔ یہاں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ ہندوستان کے رہنے والوں نے انگریزوں کے استبداد کے خلاف جب آواز بلند کی تو اردو شاعری نے ان کو سہارا دیا اور آسان اشعار کی شکل میں روح آزادی ہندوستان کے کونے کونے میں پھیلانے کی کوشش کی گئی۔

بیسویں صدی کے آغاز سے ہی ہندوستان میں سیاسی بیداری کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ اس صدی کی ابتدا میں کچھ ایسے واقعات رونما ہوئے جن کے ردعمل کے طور پر ہندوستانیوں نے نئی تحریکات شروع کیں۔ ان تحریکات سے ہندوستانیوں کے قومی اور وطنی شعور کو اور جلا ملی۔ وہ انگریزوں کے خلاف اور بھی جرأت و حوصلہ کا اظہار کرتے ہوئے برسرپیکار ہوئے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں انگریزوں کے خلاف جو سب سے زبردست تحریک چلائی گئی وہ سودیشی اور برٹش مصنوعات کے مقاطع کی تحریک تھی۔ جس کا آغاز ہندوستانیوں نے تقسیم بنگال کی مخالفت میں کیا۔

۱۹۰۵ء میں انگریزوں نے ملک کی سالمیت کو توڑنے، فرقہ واریت اور منافرت پیدا کرنے کے لیئے تقسیم بنگال کا اعلان کیا۔ اس واقعہ پر سرور جہاں آبادی نے نظم "بدنصیب بنگال" لکھی جس میں انھوں نے انگریزوں کے خلاف اپنے غم و غصہ کا بے باکانہ اظہار کیا۔

آہ اے بنگال! آلام و مصائب کے شکار
آہ اے کرزن کی پالیسی کے صید بے قرار
آہ! اے نخچیر ناوک خوردۂ دست اجل
آہ! اے خونیں جگر، خونیں کفن، خونیں مزار
آہ! اے محنت کش و حرماں نصیب و دردمند

آہ! اے برگشتہ ایام و پریشاں روزگار
آہ! اے لذت چشش ذوق مئے حب وطن
آہ! اے جرعہ کش زہراب تیغ روزگار
آہ! اے آماجگاہ ناوک جور فلک
آہ! اے صید زبوں شوریدہ حال و بے قرار
آہ! اے بنگال! اے ذلت نصیب و مبتذل
کیا ہوئی وہ تیری عظمت کیا ہوا تیرا وقار
مل گئیں تیری وفائیں خاک میں سب ہائے ہائے!
ہو گیا حکام کی نظروں میں تو بے اعتبار
اٹھ گیا فرق سعادت سے ترے تاج شرف
اشک حسرت بن کے ٹپکے تیرے درشاہوار

چھا گئی کیوں تیرے پھولوں پر خزاں بے وقت آہ!
کس نے ہے ہے لوٹ لی تیرے گلستاں کی بہار
دل کو برماتا ہوا گذرا جگر سے کس کا تیر؟
ہو گیا تو کس شمار افگن کے ناوک کا شکار
کس کی تیغ ناز نے دل پر تیرے چرکے دیئے
مرغ بسمل کی طرح جو ہے زمیں پر بے قرار
کر کے دو ٹکڑے کلیجے کے ترے یہ آہ! کون
چل دیا تجھ کو تڑپتا چھوڑ کے بیگانہ وار
آسماں گردش میں ہے تیرے مٹانے کے لیئے
دیکھیئے ہوتا ہے تیرا حشر کیا انجام کار
کر زن بیداد خو، اہل پولیس، حکام وقت
تو ہوا اف! اف! نہ کس کس کی جفاؤں کا شکار [1]

تقسیم بنگال کی مخالفت میں سودیشی تحریک بڑے زور و شور سے چلائی گئی۔ اس تحریک نے ہندوستانیوں میں حب الوطنی کے شعور کو پروان چڑھایا اور انگریزوں سے نفرت کے جذبات کو ابھارا۔

---

[1] "مخزنہ سرور" مرتبہ قاضی محمد غوث فضا حیدرآبادی ص ۶۶-۶۷

اس تحریک کی تائید میں بے شمار نظمیں لکھی گئیں۔ ان نظموں نے ہندوستانیوں میں خود اعتمادی کے جذبات کو بیدار کیا اور صدائے احتجاج بلند کرنے کی ترغیب دی۔

اکبر الہ آبادی جو اس تحریک کے حامیوں میں تھے انھوں نے کہا۔

داخل مری دانست میں یہ کام ہے بُن میں
پہنچائے گا قوت شجر ملک کی بُن میں
تحریک سودیشی پہ مجھے وجد ہے اکبر
کیا خوب یہ نغمہ ہے چھڑا دیس کی دھن میں [1]

منشی دیانرائن نگم نے اوائل ۱۹۰۶ء میں تمام مسلم مشاہیر ہند سے سودیشی تحریک کے متعلق تین سوالات پوچھے۔

۱۔ سودیشی تحریک بذات خود ملک کی ترقی کے لیئے کہاں تک مفید ہے۔ اس تحریک کے نشیب و فراز، نفع نقصان اور عمل درآمد کے متعلق آپ کی مفصل رائے کیا ہے؟

۲۔ اس تحریک میں ہندو مسلمانوں کے اتفاق کی کہاں تک ضرورت

---

[1] "کلیات اکبر الہ آبادی" حصہ اول ص ۳۱۳

ہے۔ خاص مسلمانوں کے لیئے اس سے کوئی نفع یا نقصان پہنچنے کی کہاں تک امید ہے؟

۳۔ اس تحریک کی کامیابی کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ اور اس کی کامیابی کا ہندو مسلمانوں پر جداگانہ اور ملک پر بہ حیثیت مجموعی کیا اثر ہوگا؟ [1]

حالی نے ان سوالات کے جواب اس طرح دیئے۔

"جس قدر تحریکیں اب تک ہندوستان کی بھلائی کے لیئے دیسیوں کی طرف سے ہوئی ہیں میرے نزدیک ان میں سے کوئی ایسی تحریک جس سے ملک کو حقیقی فائدہ پہنچنے کی امید ہو سودیشی تحریک سے بہتر نہیں ہوئی۔"

"ہندو مسلمانوں کے اتفاق کی نہ صرف سودیشی تحریک میں بلکہ ہر کام میں جو ہندوستان کی عام بھلائی سے تعلق رکھتا ہو اشد ضرورت ہے اور جہاں تک میں سمجھ سکتا ہوں سودیشی تحریک جیسی ہندوؤں

---

[1] "مقالات حالی" حصہ اول ص ۳۵۸

کے حق میں مفید ہے ایسی ہی مسلمانوں کے حق
میں مفید ہے"۔

"اس تحریک کا اثر ملک پر ضرور ہوگا
اور رفتہ رفتہ کم و بیش ہوتا جا رہا ہے۔
لوگوں کو اس سرنگ کا راستہ معلوم ہو گیا ہے
جس راستے سے ملک کی دولت غیر ملکیوں
میں کھینچی چلی جاتی ہے مگر اس راستے کا بند کرنا
کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے اور اس کے لیئے جلدی
کرنا نیچر سے مقابلہ کرنا ہے۔ ع
ایک دن کا کام کچھ دو ماہ کی آبادی نہیں
اگر ایک صدی میں بھی ہندوستان غیر ملکوں
کی مصنوعات کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو جائے تو
سمجھو اس کی بہت جلد کامیابی ہو گئی"۔ [1]

اقبال نے اپنے جواب کیمبرج سے بھیجے جو "زمانہ" (کانپور) مئی
۱۹۰۶ء کے شمارے میں شائع ہوئے۔ اقبال کے جوابات ملاحظہ

---

[1] "مقالات اقبال" حصہ اول ص ۳۰۸ تا ۳۱۰

ہوں۔

"سودیشی تحریک ہندوستان کے لیئے کیا ہر ملک کے لیئے جس کے اقتصادی اور سیاسی حالات ہندوستان کی طرح ہوں مفید ہے۔ کوئی ملک اپنے سیاسی حقوق کو حاصل نہیں کر سکتا جب تک کہ پہلے اس کے اقتصادی حالات درست نہ ہو جائیں۔"

"سیاسی حقوق کے حصول کی دوسری بڑی شرط کسی ملک کے افراد کے اغراض کا متحد ہونا ہے اگر اتحاد اغراض نہ ہوگا تو قومیت پیدا نہ ہوگی اور اگر افراد قومیت کے شیرازے سے ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ نہ ہوں گے تو نظام قدرت کے قوانین ان کو صفحہ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹا دیں گے۔ قدرت کسی خاص فرد یا مجموعہ افراد کی پرواہ نہیں کرتی۔

مگر رونا تو اس بات کا ہے کہ لوگ

اتفاق اتفاق پکارتے ہیں اور عملی زندگی اس
قسم کی اختیار نہیں کرتے جس سے ان کے اندرونی
رجحانات کا اظہار ہو۔ ہم کو قال کی ضرورت نہیں
ہے خدا کے واسطے حال پیدا کرنے کی کوشش کرو
مذہب دنیا میں صلح کرانے کے لیئے آیا ہے نہ کہ
جنگ کی غرض سے۔

میری رائے میں اس تحریک کی کامیابی

سے مسلمانوں کو ہر طرح فائدہ ہے۔ ایک صاحب
نے کسی اخبار میں یہ خط چھپوایا تھا کہ مسلمانوں کو
اس سے کوئی فائدہ نہیں ہے کیوں کہ عام طور پر
مسلمان زراعت پیشہ ہیں ان کا یہ ارشاد شاید
پنجاب کی صورت میں صحیح ہو تاہم یہ کہنا کہ مسلمان
زراعت پیشہ ہیں اس امر کی دلیل نہیں ہو سکتا کہ
مسلمانوں کو سودیشی تحریک کی کامیابی سے کچھ فائدہ
نہیں ہے اگر مصنوعات سستی ہوں (جو بالآخر اس
تحریک کی کامیابی کا نتیجہ ہوگا) تو خریدنے والوں کو

بھی فائدہ ہے اور بیچنے والوں کو بھی۔ مسلمان
خواہ بیچنے والے ہوں خواہ خریدنے والے ہر
طرح فائدہ میں ہیں۔"

"اگر صبر و استقلال سے کام لیا گیا تو
اس تحریک میں فوری کامیابی ہوگی۔ دوراندیشی
تمام کامیابی کا راز ہے ..... اگر اس تحریک
سے ہندو اور مسلمانوں میں اتحاد اعتماد پیدا
ہو جائے اور رفتہ رفتہ قوی ہوتا جائے تو
سبحان اللہ اور کیا چاہیے ہندوستان کے سوئے
ہوئے نصیب بیدار ہوں اور میرے دیرینہ
وطن کا نام جلی قلم سے فرق اقوام میں لکھا جائے۔" [1]

سودیشی تحریک کی نشر و اشاعت کے لیے تلوک چند محروم نے سب سے زیادہ نظمیں لکھ کر ہندوستانیوں کو سودیشی اشیاء استعمال کرنے کی تلقین کی۔ "سودیشی تحریک" میں انھوں نے تمام ہندوستانیوں کو اس تحریک میں شامل ہونے کی ترغیب دلائی۔ وہ لکھتے ہیں

---

[1] "انوار اقبال" مرتبہ بشیر احمد ڈار ص ۲۵ تا ۳۱

وطن کی اُلفت میں ہو زباں پر سدیش وستو، سدیش وستو
سناد و ہندوستاں میں گھر گھر، سدیش وستو، سدیش وستو
یہیں کی روئی، یہیں کی ململ، یہیں کا ریشم یہیں کا مخمل
نہ لنکا شائر نہ مانچسٹر، سدیش وستو، سدیش وستو
فضول جپ تپ سے یہ تو بتلا، ملے گا کیا تجھ کو اے برہمن
ثواب چاہے تو جاپ یہ کر، سدیش وستو، سدیش وستو
اسی سے ہوگی نجات حاصل، سنا یہی بزم وعظ میں تو
کہ ہے جہاں میں ثواب اکبر سدیش وستو سدیش وستو
ہوئے اسی خاک سے ہو پیدا، یہ سرزمیں ہے ہماری ماتا
ہو یہ صدا سن کے کیوں مکدر، سدیش وستو سدیش وستو
نہ دل میں جس کے ہو کچھ حمیت، وطن سے جس کو نہ ہو محبت
سناد و بزدل کو یہ کرک کر، سدیش وستو سدیش وستو
ہے ملک اپنا غریب و بے زر، نہ ڈالو غیروں کا بوجھ اس پر
کہو یہی بادل تو نگر، سدیش وستو سدیش وستو
ہے چور زخموں سے اپنا بھارت لگا دو تم مرہم محبت
علاج اس سے نہیں ہے بہتر، سدیش وستو سدیش وستو

ہو دیکھ کر دل میں شاد و فرحاں کہ ہے رعایا کو دیش کا دھیاں

سنا دو جا کر حضور قیصر، سدیشی وستو، سدیشی وستو[1]

نظم "عبادت کی جئے ہو" میں اس تحریک کی افادیت پر روشنی ڈالی ہے۔

عبادت کی جئے ہو سارے جہاں میں ہو اس کا چرچا کون و مکاں میں

چلے سودیشی ہندوستاں میں گائے پھریں ہم اپنی زباں میں

عبادت کی جئے ہو عبادت کی جئے ہو [2]

انھوں نے ایک اور نظم "سودیشی تحریک" کے نام سے لکھی اس میں انھوں نے ہندوستانیوں سے اپیل کی ہے کہ اگر انھیں اپنے ملک سے محبت ہے اور وہ ملک کی بقا چاہتے ہیں تو اس تحریک کو کامیاب بنائیں اور وطن کو فنا ہونے سے بچائیں۔

وطن کے درد نہاں کی دوا سدیشی ہے

غریب قوم کی حاجت روا سدیشی ہے

تمام دہر کی روح رواں ہے یہ تحریک

شریک حسن عمل جا بجا سدیشی ہے

ثبوت ہے یہی اپنے وطن کی الفت کا

عزیز خاطر اہل وفا سدیشی ہے

---

[1] "کاروان وطن"، تلوک چند محرومؔ ص ۱۴۱ - ۱۴۲

[2] "کاروان وطن"، تلوک چند محرومؔ ص ۵۰

وطن سے جن کو محبت نہیں وہ کیا جانیں ؟
کہ چیز کون بدیشی ہے، کیا بدیشی ہے
اسی کے سائے میں پاتا ہے پرورش اقبال
مثال سایۂ بال ہما بدیشی ہے
اسی نے خاک کو سونا بنا دیا اکثر
جہاں میں گر ہے کوئی کیمیا بدیشی ہے
فنا کے ہاتھ میں ہے جان ناتوان وطن
بقا جو چاہو تو راز بقا بدیشی ہے
ہو اپنے ملک کی چیزوں سے کیوں ہمیں نفرت

ہر ایک قوم کا جب مدعا بدیشی ہے [1]

جدوجہد آزادی کی تاریخ میں ۱۹۱۶ء سے ۱۹۳۴ء تک کا زمانہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے کیوں کہ اس دور میں جدوجہد آزادی کے قافلے کو مختلف تحریکات کے صبر آزما مراحل سے گزرنا پڑا جیسے ہوم رول کی تحریک، مانٹیگو چیمسفورڈ رپورٹ، رولٹ ایکٹ، جلیان والا باغ کا خونیں حادثہ، تحریک خلافت، تحریک

---

[1] "کاروان وطن" تلوک چند محروم ص ۱۱۱-۱۱۲

اردو شاعری میں چکبست نے اس تحریک کے
مقاصد کو عوام تک پہنچانے کے لیئے بڑی پر اثر اور پر جوش
نظمیں کہی ۔ ہوم رول تحریک کے متعلق چکبست نے جذبات،
احساسات اور خیالات کی ترجمان ان کی نظم "آوازہ قوم" کے
چند بند ملاحظہ ہوں۔

یہ خاک ہند سے پیدا ہیں جوش کے آثار
ہمالیہ سے اٹھے جیسے ابر دریا بار
لہو رگوں میں دکھاتا ہے برق کی رفتار
ہوئی ہیں خاک کے پردے میں ہڈیاں بیدار
زمیں سے عرش تلک شور ہوم رول کا ہے
شباب قوم کا ہے، زور ہوم رول کا ہے

جو دل سے قوم کے نکلی ہے وہ دعا ہے یہی
تقاضا جس پہ ناز مسیحا کو وہ صدا ہے یہی
دلوں کو مست جو کرتی ہے وہ ہوا ہے یہی
غریب ہند کے آزار کی دوا ہے یہی
نہ چین آئے گا بے ہوم رول پائے ہوئے

فقیر قوم کے بیٹھے ہیں لو لگائے ہوئے [1]

چکبست ہوم رول کی تحریک سے کس قدر متاثر تھے اس کا اظہار ان کی نظم "ہم ہوں گے عیش ہوگا اور ہوم رول ہوگا" [2] کے اس بند سے ہوتا ہے۔

اہل وطن مبارک تم کو یہ بزم اعلیٰ
جس میں نئی امیدوں کا ہے سیا اجالا
دنیا کے مذہبوں سے یہ رنگ ہے نرالا
مسجد یہی ہے اپنی اور ہے یہی شوالا

ہو ہوم رول حاصل ارمان ہے تو یہ ہے
اب دین ہے تو یہ ہے ایمان ہے تو یہ ہے [3]

ان کی ایک اور نظم "وطن کا راگ" ہے جس میں ہوم رول کے حصول کی اتنی شدید آرزو ہے کہ وہ اس کے حصول کے لیے بڑی سے

---

[1] "صبح وطن" چکبست لکھنوی ص ۳۶

[2] یہ نظم لکھنو میں دسمبر ۱۹۱۶ء کے کانگریس کے اجلاس میں گائی گئی تھی۔ (بحوالہ صبح وطن حاشیہ ص ۵۳)

[3] "صبح وطن" چکبست لکھنوی ص ۵۳

بڑی مصیبت، آفت اور پریشانیوں کو بھی خندہ پیشانی سے برداشت کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔

ہمارے واسطے زنجیر و طوق گہنا ہے
وفا کے شوق میں گاندھی نے جس کو پہنا ہے
سمجھ لیا کہ ہمیں رنج و درد سہنا ہے
مگر زباں سے کہیں گے وہی جو کہنا ہے
طلب ببول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

پہنانے والے اگر بیڑیاں پنہائیں گے
خوشی سے قید کے گوشہ کو ہم بسائیں گے
جو سنتری در زنداں کے سو بھی جائیں گے
یہ داؤ گا کے انھیں نیند سے جگائیں گے
طلب ببول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

بسے ہوئے ہیں محبت سے جن کی قوم کے گھر
وطن کا پاس ہے ان کو سہاگ سے بڑھ کر

جو شیر خوار ہیں ہندوستاں کے لختِ جگر
یہ ماں کے دودھ سے لکھا ہے ان کے سینہ پر
طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے[1]

ہوم رول کی مقبولیت کو دیکھ کر حکومت برطانیہ کو پریشانی لاحق ہوئی اور اس نے اس کو روکنے کے لیئے اس تحریک کے رہنماؤں پر پابندیاں عائد کرنا شروع کی۔ پہلے اس نے تلک کا پنجاب اور دہلی کے علاقے میں اور مسز بسنٹ کا مدھیہ پردیش اور بمبئی میں داخلہ ممنوع کر دیا۔ پھر جون ۱۹۱۷ء میں تلک اور مسز بسنٹ کو نظر بند کر دیا۔ مسز بسنٹ کی گرفتاری پر اس تحریک کے حامیوں نے سخت احتجاج کیا۔ چکبست نے مسز بسنٹ کی نظر بندی پر ایک نظم "مسز بسنٹ کی خدمت میں قوم کا پیغام" لکھی۔ نظم کے چند بند ملاحظہ ہوں۔

حکم حاکم کا ہے فریاد زبانی رک جائے
دل کی بہتی ہوئی گنگا کی روانی رک جائے

---

[1] "صبح وطن"، چکبست لکھنوی ص ۳۳ تا ۳۵

قوم کہتی ہے ہوا بند ہو پانی رک جائے
پر یہ کمبخت نہیں اب جوش جوانی رک جائے

ہوں خبردار جنھوں نے یہ اذیت دی ہے
کچھ تماشا یہ نہیں قوم نے کروٹ لی ہے

ہو چکی قوم کے ماتم میں بہت سینہ زنی
اب ہو اس رنگ کا سنیاس یہ ہے دل میں ٹھنی

مادر ہند کی تصویر ہو سینے پہ بنی
بیڑیاں پیر میں ہوں اور گلے میں کفنی

ہو یہ صورت سے عیاں عاشق آزادی ہیں
قفل ہیں جن کی زباں پر یہ وہ فریادی ہیں

آج سے شوق وفا کا یہی جوہر ہوگا
فرش کانٹوں کا ہمیں پھولوں کا بستر ہوگا

پھول ہو جائے گا چھاتی پہ جو پتھر ہوگا
قید خانہ جسے کہتے ہیں وہی گھر ہوگا

سنتری دیکھ کے اس جوش کو شرمائیں گے
گیت زنجیر کی جھنکار پہ ہم گائیں گے [1]

---

[1] "صبح وطن"، چکبست لکھنوی ص ۴۰-۴۲

ہوم رول کی تحریک ابھی جاری ہی تھی کہ حکومت برطانیہ نے مانٹیگو چمسفورڈ رپورٹ (۸ / جولائی ۱۹۱۸ء) جاری کی۔ کانگریس کی اکثریت نے اس کی مخالفت کرتے ہوئے اسے ناقابل قبول ٹھہرایا اور اپنے ایک خصوصی اجلاس میں جو اگست ۱۹۱۸ء کو بمبئی میں منعقد ہوا تھا اس کو "یاس انگیز اور ناقابل اطمینان" قرار دیا۔[1] ہوم رول کے بانیوں تلک اور مسز بسنٹ نے بھی اس کی مذمت کی۔ حسرت موہانی جو انتہا پسند نظریات کے حامی تھے اس کی بڑے زور و شور سے مخالفت کی اور اہل وطن کو اس پر فریب اسکیم کی حقیقت سے روشناس کرایا۔

کس درجہ فریب سے ہے مملو — تجویز رفارم مانٹیگو
مشہور زمانہ ہیں مسلم — دستور کے حسب ذیل پہلو
قانون پہ اختیار کامل — اعمال پہ زور زر پہ قابو
ان میں سے نہ ہو جب ایک کی بھی — گلہائے رفارم میں نہیں بو
کاغذ کے سمجھیے پھول ان کو — جن میں نہیں نام کو بھی خوشبو
مدراس کے ڈاکٹر کا یہ قول — کس درجہ ہے دلپذیر و نیکو

---

[1] تاریخ تحریک آزادی ہند، جلد سوم تاراچند مترجمہ عدیل عباسی ص ۱۷۶

مقصود ہے صرف یہ کہ تا جنگ ہم سب رہیں مصروف ایں تگاپو
اے ہندی سادہ دل خبردار ہرگز نہ چلے یہ تجھ پہ جادو
کیا پائے گا خاک پھر جب ان سے اس وقت لبی کچھ نہ لے سکا تو[1]

ستمبر ۱۹۱۸ء میں کلکتہ میں حکومت برطانیہ اور مسلمانوں کے درمیان زبردست تصادم ہوا جس سے مسلمانوں میں حکومت برطانیہ کے خلاف نفرت کے جذبات اور بھڑک اٹھے۔ ۲۷ر جولائی ۱۹۱۸ء کو انگریزی اخبار انڈین ڈیلی نیوز میں شائع ہونے والے ایک مضمون میں پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق گستاخانہ الفاظ کے استعمال سے مسلمانان کلکتہ مشتعل ہو گئے اور انھوں نے ہالی ڈے پارک موجودہ محمد علی پارک میں ۸ر ۹ر ۱۰ر ستمبر کو ایک جلسے کے انعقاد کا اعلان کیا جس کو بنگال کی گورنمنٹ نے روک دیا۔ حکومت کے اس رویہ سے مسلمان اور زیادہ مشتعل ہو گئے اس کے بعد گورنر کی دعوت پر کلکتہ کے سربرآوردہ مسلمانوں کے ایک وفد نے ان سے ملاقات کی جس میں گورنر نے مسلمانوں کو احتجاجی

---

[1] "کلیات حسرت موہانی" مولانا حسرت موہانی ص ۲۶۳

جلسے کے انتظار کا مشورہ دیا اسی دوران یورپین پولیس افسران اور انگریز فوجیوں کی مسلمانوں پر اندھا دھند فائرنگ نے مسلمانوں کے صبر و ضبط کے بندھن کو توڑ دیا اور کلکتہ میں حکومت اور مسلمانوں کے درمیان زبردست تصادم ہوگیا۔ وہاں تین دن تک" خاص طور سے ذکریا اسٹریٹ، کولوٹولہ، چیت پور بالی ڈے روڈ موجودہ سنٹرل ایونیو اور چھوا بازار کے کوچہ و بازار میں یورپین پولیس افسروں اور گورے سپاہیوں کی گولی سے شمع رسالت کے جاں نثار پروانوں نے جام شہادت نوش کیا"[1] اس سلسلے میں بہت سے افراد قانون تحفظ ہند کے تحت نظر بند اور جلاوطن کر دیے گئے[2] مولانا محمد علی جوہر کو جو اس وقت چھندواڑہ میں نظر بند تھے اس واقعہ کی اطلاع اخبارات کے ذریعہ ملی[3] تو انھوں نے شہیدان کلکتہ کو خراج عقیدت پیش

---

[1] مضمون بعنوان "مولانا محمد علی جوہر اور کلکتہ" از جناب محمد اسحاق مطبوعہ ماہنامہ "معارف" (اعظم گڈھ) مئی ۱۹۸۵ء ص ۳۷۰

[2] "حیات اجمل" حافی محمد عبدالغفار ص ۱۸۳

[3] مضمون بعنوان "مولانا محمد علی جوہر اور کلکتہ" از جناب محمد اسحاق مطبوعہ ماہنامہ "معارف" (اعظم گڈھ) مئی ۱۹۸۵ ص ۳۷۱

کرنے کے لیئے ایک نظم بعنوان "شان کلکتہ" کہی۔ چند شعر درج کیئے جاتے ہیں۔

اللہ نے بڑھائی ہے کیا شان کلکتہ
روح رسولؐ آج ہے مہمان کلکتہ
ہر سو ہیں لالہ ہائے شہیدان سرخ پوش
ہے آج گل بہار پہ ایمان کلکتہ
مسرور خلد میں ہیں شہیدان کانپور
ہوں گے شریک بزم شہیدان کلکتہ [1]

پہلی جنگ عظیم میں ہندوستان نے برطانیہ کی مدد اس امید پر کی تھی کہ جنگ کے بعد ہندوستان کے سیاسی مسئلہ پر ضرور غور و خوض کیا جائے گا لیکن جنگ کے خاتمہ پر ہندوستانیوں کے تعاون کا صلہ رولٹ ایکٹ کی شکل میں ملا۔ رولٹ بل کی اشاعت کے ساتھ ہی اس کے خلاف ہندوستان کے کونے کونے سے صدائے احتجاج بلند کی گئی اور تقریباً تمام جماعتوں اور طبقوں نے اس مسودہ قانون کو ناقابل قبول ٹھہرا کر اس کی مذمت کی۔ مہاتما گاندھی

---

[1] "سخن جوہر" مرتبہ اختر بستوی ص ۲۳

نے حکومت کی اس ناانصافی کے خلاف باقاعدہ مہم چلانے کے لیے
پرامن تحریک کے آغاز کا فیصلہ کیا اور فروری ۱۹۱۹ء میں ستیہ گرہ
لیگ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ تمام مخالفتوں کی پرواہ کیے بغیر حکومت
برطانیہ نے ۱۸ر مارچ ۱۹۱۹ء کو اس مسودہ قانون کو قانونی
شکل دے کر پاس کر دیا تو گاندھی جی نے ایک عہد نامہ مرتب
کر کے اس کے دستخط کنندگان کو دعوت دی کہ وہ رولٹ
قانون اور ہر اس قانون کو ماننے سے انکار کر دیں جس کے لیے
ستیہ گرہ کمیٹی انھیں حکم دے۔ کانگریس نے اس قانون کی مخالفت
میں ۳۰ر مارچ ۱۹۱۹ء کا دن ملک گیر ہڑتال کے لیے مقرر کیا پھر

بعد میں یہ تاریخ تبدیل کر کے ۶ر اپریل کر دی گئی۔ ۶ر اپریل
کو ملک گیر ہڑتال ہوئی۔ ملک کے مختلف شہروں میں جوش و
خروش کے ساتھ اس قانون کے خلاف مظاہرے کیے گئے۔ ایسے
وقت میں جب کہ تمام ملک میں زبردست مخالفت جاری تھی
حکومت برطانیہ نے گاندھی جی کو ۹ر اپریل کو پنجاب سے آتے ہوئے
گرفتار کر کے بمبئی بھیج دیا۔ اس کے دوسرے دن ۱۰ر اپریل کو
دو اور رہنماؤں ستیہ پال اور کچلو کو امرتسر سے شہر بدر کر دیا

گیا۔ ان لیڈروں کی شہر بدری کے خلاف احتجاج کرنے کے لیئے
اسی روز امرتسر میں تقریباً تیس ہزار پر امن مجمع ڈپٹی کمشنر
کے بنگلہ کی طرف روانہ ہوا جسے منتشر کرنے کے لیئے پولیس نے
فائرنگ کر دی۔ اس حادثے نے عوام کو اور زیادہ برانگیختہ
کر دیا اور انھوں نے واپسی پر اپنا غصہ ہر اس چیز پر اتارا
جس کا تعلق برٹش گورنمنٹ سے تھا۔ ۱۳/ اپریل کو حکومت
نے جلسہ کرنے یا جلوس نکالنے پر پابندی عائد کر دی حکومت کے

ذریعہ لگائی گئی اس پابندی کے خلاف احتجاج کرنے اور اپنے
ردعمل کا اظہار کرنے کے لیئے عوام نے اسی دن سہ پہر میں امرتسر
کے جلیانوالہ باغ میں ایک جلسے کا انعقاد کیا۔ جنرل ڈائر نے
اس جلسے کو عوام کا چیلنج سمجھا اور بغیر کسی وارننگ کے تقریباً
۲۰ ہزار کے مجمع پر فائرنگ کا حکم دے دیا۔ نہتے جلوسیوں پر
اچانک گولیوں کی بوچھار ہوئی تو جلیانوالہ باغ میں افراتفری
مچ گئی۔ سینکڑوں افراد گولیوں اور بھاگتی ہوئی بھیڑ کے پیروں
تلے کچل کر ہلاک ہو گئے۔ اس کے بعد لوگوں کو ہراساں اور خوف
زدہ کرنے کے لیئے پنجاب کے سخت گیر لفٹننٹ گورنر اڈوائر کی

جانب سے مارشل لا کا نفاذ کر دیا گیا[1] جس کے تحت انتہائی وحشیانہ مظالم ڈھائے گئے۔ جلیانوالہ باغ کے اس خونیں حادثے نے سارے ملک میں ایک اضطراب کی لہر دوڑا دی اور ہندوستانیوں کے دلوں میں انگریزوں سے نفرت کے جذبات کو اور زیادہ تیز کر دیا۔ اردو کے متعدد شعرا نے اس خونیں حادثے پر اپنے جذبات کا اظہار ان لفظوں میں کیا۔

انھیں یہ فکر ہے ہر دم نئی طرز جفا کیا ہے
ہمیں یہ شوق ہے دیکھیں ستم کی انتہا کیا ہے

گنہگاروں میں شامل ہیں گناہوں سے نہیں واقف
سزا کو جانتے ہیں ہم خدا جانے خطا کیا ہے

یہ رنگ بیکسی رنگ جنوں بن جائے گا غافل
سمجھ لے یاس و حرماں کے مرض کی انتہا کیا ہے

نیا بسمل ہوں میں واقف نہیں رسم شہادت سے
بتا دے تو ہی اے ظالم تڑپنے کی ادا کیا ہے

چمکتا ہے شہیدوں کا لہو پردے میں قدرت کے
شفق کا حسن کیا ہے شوخیٔ رنگ حنا کیا ہے

---

[1] "بغاوت کا راشٹریہ اندولن" حصہ اول (ہندی) پروفیسر مکٹ بہاری لال ص ۴۶۲

امیدیں مل گئیں مٹی میں دور ضبط آخر ہے
صدائے غیب بتلا دے ہمیں حکم خدا کیا ہے [1]

اقبال نے جلیانوالہ باغ کے قتل عام پر اپنے رنج و غم کا اظہار اس طرح کیا ہے۔

ہر زائر چمن سے یہ کہتی تھی خاک باغ
غافل نہ رہ جہاں میں گردوں کی چال سے
سینچا گیا ہے خون شہیداں سے اس کا تخم
تو آنسوؤں کا بخل نہ کر اس نہال سے [2]

ظفر علی خاں نے متعدد نظمیں کہہ کر اہل وطن کو انگریزوں کے مظالم سے روشناس کروایا اور ان میں انگریزوں سے نفرت کے جذبات کو پروان چڑھایا۔ نظم "مارشل لا" میں انھوں نے انگریزوں کے مظالم کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے۔

حکومت جن دنوں پنجاب میں تھی مارشل لا کی
تو قابل دید کے تھی اوڈوائر کی عفب نا کی

---

[1] "صبح وطن"، چکبست لکھنوی ص ۱۳۳

[2] "اردو میں قومی شاعری کے سو سال" مرتبہ علی جواد زیدی ص ۱۹۶

جب امرتسر میں ہم پر گولیاں برسے تو ہم سمجھے
کہ بوندیں ہیں یہ اہل ہند کے خون تمنا کی
سادات اس کو کہتے ہیں کہ شق قطع اعضا میں
نہ بوڑھوں ہی کو دیکھا اور نہ بچوں ہی کی پروا کی
جناب اوڈوائر کی ہم اندازی کے کیا کہنے
ثریا کے لینے والے سیر کرتے ہیں ثریا کی
ہمارے بازوؤں کی دھجیاں اڑتی تھیں گردوں پر
ہماری ٹانگ کے تسمے خبر لاتے تھے جوزا کی
یہ صورت تھی ہماری خواہ مخواہ ہندو تھے
یہ حالت تھی جناب جارج پنجم کی رعایا کی [1]

جلیانوالہ باغ کے حادثے کے بعد عوامی جوش و خروش میں شدت پیدا ہونے اور ملک میں سیاسی بیداری کی لہر میں تیزی پیدا ہونے پر ظفر علی خاں نے اپنی خوشی کا اظہار کیا۔

زندہ باش اے انقلاب اے شعلۂ خانوس ہند
گرمیاں جس کی فروغ مشعل جاں ہو گئیں

---

[1] "بہارستان" ظفر علی خاں ص ۲۲۶

بستیوں پر چھا رہی تھیں موت کی خاموشیاں
تو نے صور اپنا جو پھونکا محشرستاں ہو گئیں
جن بلاؤں سے گھرے رہتے تھے صبح و شام ہم
تیرے آتے ہی وہ انگریزوں کی درباں ہو گئیں
جتنی بوندیں تھیں شہیدان وطن کے خون کی
قصر آزادی کی آرائش کا ساماں ہو گئیں
مرحبا اے نوگرفتاران بیداد فرنگ
جن کی زنجیریں خروش افزائے زنداں ہو گئیں
زندگی ان کی ہے دین ان کا ہے دنیا ان کی ہے
جن کی جانیں قوم کی عزت پہ قرباں ہو گئیں [1]

تلوک چند محروم نے اپنی نظم "تازیانہ" میں ہندوستانیوں کو جلیانوالہ باغ کے خونیں حادثے سے روشناس بھی کروایا اور ان کے دلوں میں وطن سے محبت اور انگریزوں کے خلاف نفرت کے جذبات کو بھی ابھارا۔

تجھے تن تن کے چلنا زیب دیتا ہے، یونہی چل تو!

---

[1] "بہارستان" فضل علی خاں ص ۴۴۶

ترے اہل وطن رینگے، نہ رینگا پیٹ کے بل تو!
جہاں کو اپنی رعنائی دکھا، اور خوب کس بل تو
ہوا کیا جلیانوالے میں؟ کہ ہو بے وجہ بے کل تو
زبردستی جو چہروں سے نقاب الٹے گئے تو کیا
خزاں میں دفتر گل بے حساب الٹے گئے تو کیا

تجھے طوق غلامی سے جو عار آئے تو کیوں آئے
جو دل میں حسرت قومی وقار آئے تو کیوں آئے
سکون قلب میں گر انتشار آئے تو کیوں آئے
خیال گردش لیل و نہار آئے تو کیوں آئے

تجھے معلوم کیا، قومی حمیت کس کو کہتے ہیں
یہ غیرت مند کیا ہیں اور غیرت کس کو کہتے ہیں[1]

محروم نے اپنی نظم "نوجوانوں سے خطاب" میں نوجوانوں کو مخاطب کر کے ان میں جوش حمیت کو بڑھانے اور وطن کو غلامی کی ذلت سے چھٹکارا دلانے کی تلقین کرتے ہیں۔

نوجوانان کشور پنجاب — نونہالان گلشن شاداب

---

[1] "کاروان وطن"، تلوک چند محروم ص ۱۵۱

ذلت مادر وطن پر تم — جائے حیرت ہے یوں رہو گم سم
جوش آئے نہ خون غیرت میں — بے حسی ہو رگ حمیت میں
تم کو آخر یہ ہو گیا کیا ہے؟ — "آخر اس درد کی دوا کیا ہے"؟
مارشل لا کو بھول بیٹھے ہو؟ — جھوٹے وعدوں پہ پھول بیٹھے ہو؟
کیا نہیں جور اوڈوائر یاد؟ — یا نہیں قتل عام ڈائر یاد؟
جالس[1] کے وہ پر عتاب احکام — اور ان[2] کے زشت و دشنام

بے حیائی شتھ[3] کی یاد کرو
کیوں نہ کچھ اس کا انسداد کرو [4]

احمق پھپھوندوی نے بھی حکومت برطانیہ کے جبر و تشدد، رولٹ بل، جلیانوالہ باغ کے حادثے اور مارشل لا کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔

جگر کے داغ دل کے زخم طرفہ رنگ لائے ہیں
زمیں جلیانوالہ کی مرے سینے پہ حیراں ہے [5]

---

[1] امرتسر میں مارشل لا کا حاکم اعلیٰ۔ [2] دوبدنام ڈپٹی کمشنر
بحوالہ "کاروان وطن" تلوک چند محرومؔ حاشیہ ص ۱۴۸
[3] "کاروان وطن" تلوک چند محرومؔ ص ۱۴۸
[4] "زندان حماقت" احمق پھپھوندوی ص ۱۱

دبے گی اب نہ شورش ملک دل میں شوق و ارماں کی
نفاذ دولت بل ہو خواہ حکم مارشل لا ہو [1]

انھیں یقین تھا کہ جابر و ظالم حکومت کا خاتمہ جلد از جلد ہو جائے گا اور ملک غلامی کی زنجیروں سے آزاد ہو جائے گا۔

فلک نے دائر کمبخت کے انداز اڑائے ہیں
ستم کرنے کے ایذا توڑنے کے ظلم ڈھانے کے
جفا و ظلم نصب العین ہوگا جس حکومت کا
یقیناً خاک ہو جائے گی وہ تھوڑے زمانے میں [2]

جلیانوالہ باغ کے خونیں حادثے کو سرجو نے بھی بیان کیا ہے۔

بے گناہوں پر بموں کی بے خطر بوچھار کی
دے رہے ہیں دھمکیاں بندوق کی تلوار کی
باغ جلیاں میں لہتوں پر چلائیں گولیاں
پیٹ کے بل بھی رینگایا ظلم کی حد پار کی
ہم غریبوں پر کیے جس نے ستم بے انتہا
یاد بھولے گی نہیں اس دائر بدکار کی

---

[1] "زندان حماقت" احمق پھپھوندوی ص ۶۰
[2] "زندان حماقت" احمق پھپھوندوی ص ۹

یا تو ہم ہی مر مٹیں گے یا تو لے لیں گے سوراج
ہوتی ہے اس بار حجت ختم اب ہر بار کی
خون مظلوماں کی سرخی جو اب تو گہری دھار میں
کچھ دنوں میں دوستی ہے آبرو اغیار کی [1]

حکومت برطانیہ کی جانب سے پنجاب میں ہندوستانیوں پر کیئے گئے مظالم کی داستان کو اس دور کے ایک شاعر (جن کا نام معلوم نہ ہو سکا) نے بھی "پنجاب کا ہتیا کانڈ" میں بیان کیا ہے۔

ظالم صفت حکومت تجھ پہ غضب خدا کا
رعیت[2] کو تو نے اپنی ترچھی نظر سے تاکا
پنجاب میں ہزاروں بچوں کو بھون ڈالا
شیطان کی ہے خصلت یا تیر ہے قضا کا
واحسرتا وہ صدہا گھر بار کا اجڑنا
وہ نقشۂ اجل کا آنکھوں کے آگے پھرنا

---

[1] "ضبط شدہ نظمیں" مرتبین خلیق انجم۔ مجتبیٰ حسین ص ۱۳۲
[2] بسکون عین و فتح یا (کذا) بحوالہ "ضبط شدہ نظمیں" مرتبین خلیق انجم۔ مجتبیٰ حسین حاشیہ ص ۱۶۲

کوہ قضا کا سر پر پل بھر میں ٹوٹ پڑنا
زخم جگر کے ٹانکوں کا یک بیک اُدھڑنا
شان جلال باری قہر خدا کا نقشہ
بھائی کا اپنے چھوٹے بھائی سے یوں بچھڑنا
ڈائر کا ہم ہنتوں پہ آکے فائر کرنا
وہ جان ناتواں کا کشتی قضا سے لڑنا
تھا فتنہ قیامت اس وقت جو ستم تھا
پھر اپنے اپنے جرموں سے یک بیک مکرنا
پیٹوں کے بل سے ہم کو رستے میں یوں چلانا
ہنٹر کی چوٹ سے پھر یوں جسم کا ادھڑنا
ہے یہ ہی رحم تیرا یہ ہی تری حیا ہے
الطاف کے بجائے رعیت سے یوں بگڑنا [1]

اس زمانہ میں جب کہ انگریزوں سے نفرت کا جذبہ دن بہ دن تیز تر ہوتا جارہا تھا خلافت کی تحریک کا آغاز ہوا۔ حالاں کہ یہ تحریک خلافت عثمانیہ اور ترک اقتدار اعلیٰ کی بحالی کے مقصد

---

[1] "ضبط شدہ نظمیں" مرتبین خلیق انجم۔ مجتبیٰ حسین ص ۱۶۲-۱۶۳

سے شروع کی گئی تھی۔ لیکن اس تحریک نے مسلمانوں میں انگریزوں سے نفرت کو فروغ دینے اور تمام ملک میں سیاسی شعور کو عام کرنے میں بڑی مدد دی۔ اگرچہ اس تحریک کا اثر ملک میں صرف چند سالوں تک ہی رہا اور ترکی میں خلافت کے خاتمہ پر ہندوستان میں یہ تحریک ختم ہو گئی لیکن اس کے باوجود اس تحریک کی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس تحریک نے جد وجہد آزادی میں شدت پیدا کرنے اور عوام کو منزل آزادی کی طرف عزم و ارادے کے ساتھ بڑھنے کا حوصلہ عطا کرنے میں زبردست مدد کی۔

خلافت تحریک کے ایک اہم رہنما محمد علی جوہر تھے ترکوں کی حمایت میں ایک مضمون "چوائس آف دی ٹرکس" لکھنے کی پاداش میں انھیں نظر بندی کا حکم دیا گیا۔ اپنی نظر بندی پر انھوں نے اپنے جذبات کا اظہار اس طرح کیا۔

یہ نظر بندی تو نکلی رد سحر — دیدہ ہائے ہوش اب باکر کھلے
فیض سے تیرے ہی اے قید فرنگ — بال و پر نکلے قفس کے در کھلے[1]
مستحق دار کو حکم نظر بندی ملا — کیا ہوں کیسی رہائی ہوتے ہوتے رہ گئی

---

[1] سخن جوہر مرتبہ اختر بستوی ص ۳۸۵-۵۰

تحریک خلافت کے دوران مرزا طاہر بیگ طاہر مراد آبادی[1] کی نظم "صدائے خاتون" جو والدہ علی برادران کی زبان میں ادا ہوئی بہت زیادہ مقبول ہوئی۔ نظم کے کچھ شعر ملاحظہ ہوں۔

بولیں اماں محمد علی کی — جان بیٹا خلافت پہ دے دو
ساتھ تیرے ہیں شوکت علی بھی — جان بیٹا خلافت پہ دے دو
بوڑھی اماں کا کچھ غم نہ کرنا — کلمہ پڑھ کر خلافت پہ مرنا
پورے اس امتحاں میں اترنا — جان بیٹا خلافت پہ دے دو
ہوتے میرے اگر سات بیٹے — کرتی سب کو خلافت پہ صدقے
ہیں یہی دین احمد کے رستے — جان بیٹا خلافت پہ دے دو
حشر میں حشر برپا کروں گی — پیش حق تم کو لے کر چلوں گی
اس حکومت پہ دعویٰ کروں گی — جان بیٹا خلافت پہ دے دو[2]

ہندوستان کی جد وجہد آزادی نے ایک نیا رخ اس وقت اختیار کیا جب خلافت کمیٹی اور کانگریس پارٹی نے گاندھی جی کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے ترک موالات کی تحریک شروع کرنے کا فیصلہ کر لیا

---

[1] "پیکر نغمہ" نعیم حامد علی ص ۱۷

[2] "تحریک آزادی میں اردو کا حصہ" ڈاکٹر معین الدین عقیل ص ۲۲۴

اس کے ساتھ ہی جمیعتہ العلمائے ہند نے بھی عدم تعاون کی تجویز منظور کی اور اس کی تائید مسلم لیگ نے بھی کی۔ ان تمام اہم جماعتوں کے عدم تعاون کی تجویز منظور کرتے ہی ملک میں بڑے جوش و ولولے کے ساتھ سول نافرمانی کی تحریک کا آغاز ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی بہت جلد یہ تحریک تمام ملک میں پھیل گئی اور عوام کی زیادہ سے زیادہ تعداد اس میں شامل ہونے کی وجہ سے جد وجہد آزادی کی رفتار میں تیزی سے اضافہ ہوا۔ اس تحریک کا اردو شاعری پر بہت زیادہ اثر پڑا۔ اس دور میں ایسی کئی نظمیں لکھی گئیں جن میں ترک موالات کی خصوصیات کی تشہیر کے ساتھ اس کی خوبیاں بیان کی گئیں تھیں یہ نظمیں عوام کو جد وجہد آزادی میں شریک ہونے اور ان میں حب الوطنی کے جذبہ کو فزوں تر کرنے میں معاون ثابت ہوئیں۔

سول نافرمانی کے آغاز کے لیئے گاندھی جی نے بارڈولی کی تحصیل چنی اور جب انھوں نے وائسرائے کو ایک خط کے ذریعہ اس بات کی اطلاع دی تو اس موقع پر ظفر علی خاں نے "گاندھی۔ بارڈولی سے پہلے" کہی جس میں انھوں نے گاندھی جی کے کارہائے نمایاں کو سراہا۔

گاندھی نے آج جنگ کا اعلان کر دیا
باطل سے حق کو دست و گریبان کر دیا
سر رکھ دیا رضائے خدا کی حریم پر
خنجر کو پھر حوالۂ شیطان کر دیا
ہندوستاں میں ایک نئی روح پھونک کر
آزادیٔ حیات کا سامان کر دیا
دشمن میں اور دوست میں ہونے لگی تمیز

کتنا بڑا یہ ملک پہ احسان کر دیا
دے کر وطن کو ترکِ موالات کا سبق
ملت کی مشکلات کو آسان کر دیا
شیخ اور برہمن میں بڑھایا وہ اتحاد
گویا انھیں دو قالب و یک جان کر دیا
اوراقِ جبر و جور و جفا کو بکھیر کر
شیرازہ سلطنت کا پریشان کر دیا
تن من کیا نثار خلافت کے نام پر
سب کچھ خدا کی راہ میں قربان کر دیا

پروردگار نے کہ وہ ہے منزلت شناس
گاندھی کو بھی یہ مرتبہ پہچان کر دیا[1]

تحریک عدم تعاون کی اسکیم میں سرکاری خطابات کو نہ قبول کرنا، کونسلوں، سرکاری اسکولوں، کالجوں اور عدالتوں کا بائیکاٹ کرنا، بدیشی کپڑے کے استعمال کا مقاطعہ کرنا، کھدر اور چرخے کا پرچار کرنا، ملکی تعلیم کو جاری کرنا اور پنچایتی عدالتوں کا قیام عمل میں لانا وغیرہ شامل تھا۔

احمق پھپھوندوی کا خیال تھا کہ سول نافرمانی کی تحریک اسی وقت کامیاب ہو سکتی ہے جب ملک میں غیر ملکی چیزوں کی درآمد ہی نہ ہو۔ ان کی شدید آرزو تھی کہ ملک میں ہر چیز سودیشی استعمال ہو یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے ہم وطنوں میں یہ احساس پیدا کرنے کی کوشش کی کہ وہ غیر ممالک کی اشیاء کے محتاج نہ ہوں بلکہ ان کا انحصار صرف اپنے ملک میں تیار شدہ چیزوں پر ہو۔

---

[1] "بہارستان" ظفر علی خاں ص ۵۸م

خدا کی شان کبریا بھی ہمیں بنا نہیں آتا

کفن کے واسطے بھی احتیاج مانچسٹر ہے [1]

تحریک ترک موالات میں سرکاری خطابات و اعزازات کا مقاطعہ بھی شامل تھا۔ احمق پھپھوندوی نے بڑے ہی بے باکانہ انداز میں حکومت برطانیہ کو یہ جتلایا کہ ان کی نظروں میں حکومت کی طرف سے عطا کردہ خطابات گردن میں ڈالے جانے والے پٹے کی طرح ہیں۔

آپ اپنے اعزاز و خطابات اپنے گھر میں رکھ چھوڑیں

ہم کو یہ لعنت کے پٹے گردن میں درکار نہیں [2]

اپنی ایک رباعی میں انھوں نے کہا

خواہاں خطاب ہوں نہ ہوں طالب جاہ

شیطان مجھ کو کرے گا کیوں کر گمراہ

میں اور انگریز کی خوشامد! کیا خوب!

لاحول ولاقوۃ الا باللہ [3]

---

[1] "زندان حماقت" احمق پھپھوندوی ص ۱۹

[2] "زندان حماقت" احمق پھپھوندوی ص ۵۶

[3] "زندان حماقت" احمق پھپھوندوی ص ۸۵

تحریک عدم تعاون جو ۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۴ء کے درمیان چلائی گئی اس کی رفتار ہمیشہ ایک جیسی نہیں رہی۔ اس کی رفتار کبھی تیز تو کبھی سست رہی۔ اس دوران اکثر مواقع ایسے بھی آئے جب تحریک کے رہنماؤں نے اسے بند کر دینے کا فیصلہ بھی کیا۔ ایسا ہی ایک موقع ۱۲ر فروری ۱۹۲۲ء کو آیا جب کانگریس نے بارڈولی میں ورکنگ کمیٹی کی نشست میں ہر قسم کی تحریک بند کر دینے کے فیصلے کا اعلان کیا۔ یہ فیصلہ گورکھپور کے مقام چوراچوری میں ۵ر فروری ۱۹۲۲ء کو ہونے والے واقعے کی وجہ سے گاندھی جی کی ایما پر کیا گیا تھا۔ تحریک کا بند کیا جانا حکومت برطانیہ کے لیے بڑا ہی سودمند ثابت ہوا اس نے ۱۰ر مارچ ۱۹۲۲ء کو مہاتما گاندھی کو گرفتار کر کے چھ سال قید کی سزا سنادی۔

برطانوی حکومت تحریک کے عروج کے زمانہ سے ہی اس کوشش میں تھی کہ کسی طرح ملک کی دو بڑی قوموں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو توڑ دے۔ لیکن اس کی یہ کوشش بار آور نہیں ہو رہی تھی۔ تحریک کے اچانک بند کر دیئے جانے سے برطانوی حکمران بڑی چالاکی اور ہوشیاری سے

فرقہ وارانہ فسادات کی آگ بھڑکانے میں کامیاب ہو گئے۔ ملک میں فرقہ وارانہ فسادات کی آگ بھڑک اٹھی۔ ایسے نازک اور پرآشوب وقت میں بھی اردو شعراء نے اپنی نظموں سے اہل وطن کے دلوں میں اتحاد و یکجہتی کی شمعیں روشن کرنے کا کام انجام دیا۔ اور انھیں اتحاد کی تلقین کرتے ہوئے یہ ذہن نشین کرایا کہ حب الوطنی کا ایک اہم جزو قومی یکجہتی ہے جس کے بغیر آزادی حاصل کرنا مشکل ہے۔

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ ساری تخلیقات جو جہد آزادی کے دوران تفسیر سیاست کے طور پر وجود میں آئیں انھیں کس طرح حب الوطنی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے یا ان کا حب وطن سے کیا رشتہ ہے؟ اس طرح ہندو مسلم اتحاد یا فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا حب الوطنی سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ اس سے پہلے کہ آپسی بھائی چارہ، ہندو مسلم اتحاد، سیاسی تحریکات وغیرہ کی شاعری میں مثالیں پیش کی جائیں یہ عرض کرنا ہے کہ جس سے محبت ہوتی ہے اسے بہتر سے بہتر شکل میں دیکھنے کی خواہش، تمنا اور تڑپ ہوتی ہے۔ دوسری طرف ہر دور میں محبت کے مظاہر

بھی اگ رہے ہیں۔ چناں چہ اس دور میں حب الوطنی کا ایک رخ تو یہ تھا کہ سب کے دل میں تمنا و تڑپ تھی کہ انگریزوں کی غلامی سے چھٹکارا ملے اور ہندوستان آزاد ہو۔ یہ بھی جانتے تھے کہ بغیر باہمی اتحاد کے آزادی نہیں مل سکتی اور یہ بھی احساس تھا کہ آپس کا یہ اختلاف دوسری اقوام کی نظروں میں رسوائی کا سبب بن رہا ہے اس تناظر میں آئندہ جو مثالیں پیش کی گئی ہیں انھیں دیکھنا چاہیئے۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کو آپسی تفریق بھلا کر جنگ آزادی میں شامل ہونے کی ترغیب دینے والے شعراء میں ایک اہم نام ظفر علی خاں کا ہے۔ انھوں نے اپنے ہم وطنوں کو محبت اور اُخوت کا درس دیتے ہوئے کہا

پسینہ گرے ہندوؤں کا جہاں
وہاں تم مسلمان کا خوں بہاؤ
زمیں ہو جب اس خون سے لالہ زار
تو اس پر بساط اخوت بچھاؤ [1]

---

[1] "بہادرستان" ظفر علی خاں ص ۵۹

اپنی نظم "گوکل کی بانسری کی گونج" میں ہندو مسلم اتحاد کا درس دیتے ہوئے کہا

مٹائیں برہمن و شیخ تفرقے اپنے
زمانہ دونوں کے گھر کا غلام ہو جائے
بدیسیوں کی برائی کی دھجیاں اڑ جائیں
جہاں پہ تیغ دو دم بے نیام ہو جائے [1]

"نوجوانان وطن سے خطاب" میں بھی انھوں نے ہندو مسلم اتحاد کی تلقین کی ہے۔

مل جاؤ ہندوؤں سے اور دونوں مل کے کرلو
اپنے وطن میں قائم ایک ایسی راجدھانی
شیخ اور برہمن کو ایک آنکھ سے جو دیکھے
کرتا ہو عدل جس کا دونوں کی پاسبانی
فرصت جو مل گئی ہے جانو اسے غنیمت
اور چھوڑو اپنی اپنی دیرینہ قصہ خوانی
حالی کی روح تم کو پیغام دے رہی ہے

---

[1] "بہارستان" ظفر علی خاں ص ۴۲۴

لہرا رہی ہے ننگا کھیتوں کو دے لو پانی
کچھ کر لو نوجوانو اٹھتی جوانیاں ہیں [1]

ملک میں فرقہ واریت کی آگ کو بڑھاوا دینے میں فرقہ پرست تنظیموں نے بھی دل کھول کر حصہ لیا۔ ہندو مسلم اتحاد کو توڑنے والی تنظیموں کو ظفر علی خاں نے اس طرح مخاطب کیا

نہیں لاتے ہیں خاطر میں یہ لوڈی — مری تنظیم تیرے سنگھٹن کو
مگر ہو جائے سمجھوتا ہمارا — تو بدلیں آج ہی اپنے چلن کو

خدارا اب تو چھوڑو خانہ جنگی
بچانا ہے جو ناموس وطن کو [2]

انھوں نے ہندوستانیوں کو یہ احساس دلایا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی اتحاد کے بغیر آزادی کا حصول بہت مشکل کام ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کو متحد ہو کر جنگ آزادی میں شریک ہونے کی ترغیب دیتے ہوئے "شراب خانہ ساز" میں کہا

آزادی وطن کا پھر میرا اڑائے جا

---

[1] "نگارستان" ظفر علی خاں ص ۴۴۹

[2] "بہارستان" ظفر علی خاں ص ۴۵۲

ہندوستاں کے نام کا ڈنکا بجائے جا
ہندو جو شیر ہوں تو مسلماں ہوں شکر
دونوں میں اتحاد کا رشتہ بڑھائے جا
رسوائیوں کے داغ سے آلودہ ہے جبیں
عزت کے چاند بھی اس میں لگائے جا
گردش میں لا پیالۂ مئے خانہ ساز کا
اور قسمت فرنگ کو چکر میں لائے جا [1]

انھوں نے اپنے ہم وطنوں کو خبردار کیا کہ ان کا ملک غلامی کی زنجیروں سے اسی وقت آزاد ہوگا جب تمام اہل ملک اتحاد اور یکجہتی کے رشتے میں منسلک ہوں گے۔ فرقہ وارانہ ذہنیت میں الجھ کر ہندوستانی برطانوی حکمرانوں کی طاقت میں اضافہ کر رہے ہیں۔

لٹکی ہوئی ہیں سر پہ غلامی کی لعنتیں
ہے "ست بچن" کہیں تو کہیں "جی حضور" ہے
آپس کی پھوٹ کر کے رہے گی ہمیں تباہ

---

[1] "بہارستان" ظفر علی خاں ص ۵۵۴

سمجھیں یہ نکتہ اب ہمیں اتنا شعور ہے
لندن کی گول میز کو یاروں نے جا لیا
لیکن یہ قافلہ ابھی دہلی سے دور ہے
اس وقت تک نہیں اگر آزاد ہو سکا
ہندوستان خود یہ ترا ہی قصور ہے [1]

سیماب اکبر آبادی نے بھی ہندوستانیوں کو درس اتحاد دیا کہ اگر انھیں آزادی حاصل کرنا ہے تو ملک کی فضا کو باہمی اختلافات سے مسموم نہ ہونے دیں بلکہ متحد ہو کر آزادی کامل کے حصول کی جد وجہد کریں۔ ان کی نظم "اختلاف" کا ایک بند پیش ہے جس میں انھوں نے ظاہر کیا ہے کہ ہندوستانیوں کی ناکامی کی سب سے بڑی وجہ ان کے آپسی اختلافات ہیں۔

پہلے باہم متحد ہو جائیں آزادی پرست
تا نہ ہو آزادی کامل کا باطل ہندو بست
اختلاف عام ہے سب سے بڑی وجہ شکست
فتح کی ضامن نہیں ہے یہ غلامانہ مصاف

---

[1] "بہارستان" ظفر علی خاں ص ۶۳م

اختلاف

اختلاف اے اختلاف [1]

تلوک چند محروم بھی ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی تھے انھوں نے اتحاد و یکجہتی کے جذبے کو فروغ دینے کے لیے متعدد نظمیں لکھیں۔ نظم "آئینہ حال" میں انھوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کی باہمی کشیدگی پر اپنے رنج و غم کا اظہار اس طرح کیا ہے۔

در اغیار پہ دونوں کو ہے ذوق جبیں سائی
کہ برپا ہندو و مسلم میں ہے ہنگامہ آرائی
انھیں برباد ہو کر بھی سمجھ اتنی نہیں آئی
نفاق ایسی بری شئے ہے جو پربت کو کرے رائی
قریب ساحل اپنے ملک کا بیڑا ڈبونے کو
یہ بحث کفر و ایماں وقت پر یاروں کو یاد آئی
عمل پیرا ہوں مذہب پر اگر مذہب کے دیوانے
بہم دیگر گریباں گیر کب ہوں مثل سودائی
نزاع باہمی سے اب وہ زائل ہوتی جاتی ہے

---

[1] "ساز و آہنگ" سیماب اکبر آبادی ص ۶۶

بدقت قوم نے حاصل جو کی تھی کچھ توانائی
بہم لڑ لڑ کے کھو بیٹھیں گے دونوں آبرو اپنی
یہ اپنے ہاتھ سے ہونے لگے ہیں وقف رسوائی
تمیز خیر و شر ان کو خدائے پاک و برتر دے
کرے گی کیا اثر محروم تیری خامہ فرسائی [1]

نظم "انقلاب دہر" کے شعر ملاحظہ ہوں

دور زماں جو دشمن امن و اماں ہوا
برہم نظام کشور ہندوستاں ہوا
جینا یہاں کا باعث آزار جاں ہوا
دوزخ نمایہ خطہ جنت نشاں ہوا
گھیرا تمام ملک کو نفرت کی آگ نے
دل داغ دار کر دیئے ناحق کی لاگ نے
اہل وطن میں آہ! وہ صدق و صفا کہاں
وہ لطف درمیانہ وہ مہر و وفا کہاں
ہمسائیگی کی صحبت صبح و مسا کہاں

---

[1] "کاروان وطن" تلوک چند محروم ص ۹۷ - ۹۸

لیل و نہار اب وہ گئے اے خدا کہاں
لے جائے ہم کو یہ ستم نارواکہاں
اس ابتدا کی دیکھیے ہو انتہا کہاں؟
پائے کہاں سکوں دل بے تاب دیکھیے
ہیرا کہاں وطن کا ہو عزقاب دیکھیے [1]

نظم "پھر بھی لڑتے ہیں" میں مخدوم نے تلخ و تند لہجہ میں محکوم ہندوستانیوں کو مخاطب کیا ہے۔

یہ بھی غلام غیر کے، وہ بھی غلام ہیں
کرتے ہیں روز و شب جو غلاموں کے کام ہیں
مجبور و بے نوا ہیں کہ پابند دام ہیں
نے پر فشاں ہوا میں، نہ بالائے بام ہیں
کنج قفس ملا ہے، مگر پھر بھی لڑتے ہیں!
کہتے ہیں کہ کوئی لڑائے تو ہم لڑیں
لاشیں ہماری کوچہ و بازار میں سڑیں
لڑنے سے باز آئیں جو بنی جوتیاں پڑیں

---

[1] "کاروان وطن"، تلوک چند محروم ص ۱۱۳ - ۱۱۴

کچھ شرم ہو تو خاک حمیت میں ہم گریں
سب کچھ سمجھ لیا ہے مگر پھر بھی لڑتے ہیں [1]

مخدوم نے "ترانۂ نوروز" میں بھی یکجہتی کا درس دیا۔

چھوڑو حسد ہو جاؤ تم ایک دوسرے کے میت پھر
ہندوستاں میں تاکہ ہو تازہ وفا کی ریت پھر
سینوں میں، ہاں، پیدا کرو پیارے وطن کی پریت پھر
ہر اک طرف گونجا کریں جب وطن کے گیت پھر

جاگو اب اہل وطن، دیکھو فضا نوروز کی [2]

جوش نے بھی فرقہ وارانہ منافرت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور ملک کی آزادی کے لیے ہندوؤں اور مسلمانوں کو متحد کرنے کے لیے اس عزم کا اظہار کیا۔

ڈال دوں گا طرح نو اجمیر اور پریاگ میں
پھونک دوں گا کفر و ایماں کو دہلتی آگ میں
کوثر و گنگا کو اک مرکز پہ لانے کے لیے

---

[1] "کاروان وطن" تلوک چند محروم ص ۱۱۷ - ۱۱۸

[2] "کاروان وطن" تلوک چند محروم ص ۷۰

اک نیا سنگم بناؤں گا زمانے کے لیے
ایک دین نو کی لکھوں گا کتاب زرفشاں
ثبت ہوگا جس کی زریں جلد پر ہندوستاں [1]

فرقہ وارانہ فسادات کے سبب ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان خلیج بڑھتی جا رہی تھی جس کی وجہ سے جد وجہد آزادی کو شدید خطرہ درپیش تھا۔ جوشؔ نے تفریق پسندی کے خلاف اپنی آواز اس طرح بلند کی۔

غیر کی خدمت گزاری باہمی خونریزیاں
دوپہر کی دھوپ سر پر، اور یہ خواب گراں

حیف اے ہندوستاں صد حیف اے ہندوستاں!
ابر بن بن کر برستی ہیں، خبر بھی ہے تجھے
گلشن اعدا پہ تیری باہمی خونریزیاں

حیف اے ہندوستاں صد حیف اے ہندوستاں! [2]

نظم "بھوکا ہندوستان" میں بھی جوشؔ نے اہل ہند کو یہ احساس

---

[1] "شعلہ وشبنم" جوشؔ ملیح آبادی ص 19

[2] "شعلہ وشبنم" جوشؔ ملیح آبادی ص ۱۰۳

دلایا کہ فرقہ وارانہ فسادات غلامی کی زنجیروں کو اور مضبوط کرتے ہیں۔ نظم کے چند شعر درج کیے جاتے ہیں جن میں فرقہ واریت کے خلاف صدائے احتجاج بھی ہے اور جدوجہد آزادی میں شامل ہونے کا درس بھی۔

آہ اے ہندوستاں! اے مفلسوں کی سرزمیں
اس کمرے پر کوئی تیرا پونچھنے والا نہیں
آہ اک دل بھی ترے افلاس پر ملتا نہیں
اب تو اک روٹی کا ٹکڑا بھی تجھے ملتا نہیں
ہندو و مسلم نہیں اٹھتے تری امداد پر
تف ہے ایسی بے حمیت ناخلف اولاد پر
ہائے کیا کرتا تھا ان کو اور کیا کرتے ہیں یہ
گائے اور باجے پہ لڑنے کے لیے مرتے ہیں یہ
ناخلف بچے تری جانب نظر کرتے نہیں
ان کو جس میداں میں مرنا چاہیے مرتے نہیں
ان سے کہہ دے، تا کجا بربادیاں؟ آباد ہو
یا گلے خود کاٹ کر مر جاؤ، یا آزاد ہو [1]

---

[1] "شعلہ و شبنم" جوش ملیح آبادی ص ۱۰۹

احمق پھپھوندوی نے بھی ہندوؤں اور مسلمانوں کو یہ احساس دلایا کہ انگریز ہی ان کے مشترکہ دشمن ہیں اس لیئے انھیں متحد ہو کر ان کے خلاف سینہ سپر ہونا چاہیئے۔ ان کا ایک قطعہ ملاحظہ ہو۔

گئے وہ دن کہ تھا جب اختلاف ہندو و مسلم
بس اب اک دوسرے کے مونس و غمخوار ہو جاؤ
دکھا دو اپنی قوت اپنے دشمن کے مقابل میں
وہ پتھر ہے تو تم اک آہنی دیوار ہو جاؤ [1]

حالاں کہ ملک میں حکومت برطانیہ کی چالبازیوں کی وجہ سے فرقہ وارانہ فسادات برپا ہوئے لیکن ہندوستانیوں میں انگریزوں سے دشمنی کے جذبات میں کسی قسم کی کمی واقع نہ ہوئی۔ حکومت برطانیہ نے جب سائمن کمیشن کے تقرر کا اعلان کیا جس کا کام ہندوستان کا آئندہ آئین بنانا تھا تو تمام ہندوستانیوں نے متحد ہو کر اس کمیشن کا مقاطعہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ سائمن کمیشن ۳/ فروری ۱۹۲۸ء کو برطانیہ سے بمبئی پہنچا۔ ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی سائمن کمیشن کے ممبران کا خیر مقدم بائیکاٹ، ہڑتالوں اور کالے

---

[1] "زندان حماقت" احمق پھپھوندوی ص ۸۴

جھنڈوں، سائمن واپس جاؤ، ہندوستان ہندوستانیوں کا ہے،
کے پرجوش نعروں سے کیا گیا۔

اردو میں بے شمار نظمیں منظر عام پر آئیں جن میں
کمیشن کے بائیکاٹ کی تحریک کو کامیاب بنانے کے لیئے عوام کو ذہنی
طور پر تیار کرنے کی کوشش کی گئی۔ کمیشن کے ممبران جب لاہور
پہنچنے والے تھے اس وقت ظفر علی خاں نے اہل لاہور کو اور ان
کے ساتھ ساتھ تمام ہندوستانیوں کو تلقین کی کہ ان کا خیر مقدم کالی
جھنڈیوں سے کریں۔

سائمن صاحب کے استقبال کا وقت آگیا
جاگ اے لاہور اپنے فرض کو پہچان کر
ان کے رستے میں کئی آنکھیں بچھائی جائیں گی
تو بھی اے خون جگر چھڑکاؤ کا سامان کر
چین خود لیں گے نہ ان کو لینے دیں گے ایک دم
گھر سے اے پنجابیو نکلو یہی میں ٹھان کر
دیل سے اتریں تو کالی جھنڈیاں ہوں سامنے
جن کے اندر تم کھڑے ہو سینہ اپنا تان کر

تجھ کو اے پنجاب اگر کچھ بھی ہے پاس آبرو
اپنی اس عزت پر اپنی جان کو قربان کر
طالب علموں کے خونِ گرم کے کھولاؤ سے
جوشِ آزادی کا برپا آتشیں طوفان کر
نوجوانوں کو پلا جامِ شرابِ زندگی
مشکلیں زنداں و دار و آشام کی آسان کر
کٹ کے بیگانوں سے مل جانا یگانوں سے سیکھا
لارڈ برکن بیڈ کو نرگس کی طرح حیران کر
ہر قدم پر ہو کمیشن کا مکمل بائیکاٹ
طول و عرضِ ملک میں ڈنکے کی چوٹ اعلان کر [1]

جدوجہد آزادی کے اس دور میں وطن پرستی اور حب الوطنی کا رجحان تیز تر ہوا۔ اس دور میں حب الوطنی کے جذبات کو فروغ دینے میں اردو شاعری نے گراں قدر خدمات انجام دیں۔ اس دور میں مختلف تحریکات پر لکھی گئی نظموں کے علاوہ ایسی نظمیں بھی کہی گئیں جن میں سرزمینِ وطن سے والہانہ وابستگی کا

---

[1] "بہارستان" ظفر علی خاں ص ۲۰۴

اعلان اس کی عظمتوں اور رفعتوں کا اعتراف اور اس کے لیئے مر مٹنے کے جذبہ کا اظہار کر کے ہندوستانیوں کے دلوں میں مادر وطن سے عقیدت و محبت کے پاکیزہ جذبات کو سمونے کی کوشش کی گئی۔ اس دور میں تقریباً ہر شاعر نے فضائے ملک میں ایسے نغمے بکھیرے جنھوں نے اہل ملک کو حب الوطنی کے مقدس جذبات سے سرشار کرنے اور ان کے وطنیت کے شعور کو پختگی عطا کرنے میں زبردست مدد دی۔

جن شعراء نے اپنے ہم وطنوں کو حب الوطنی کے مقدس جذبہ میں سرشار کرنے کی کوشش کی ان میں سب سے نمایاں نام ظفر علی خاں کا ہے۔ ان کی والہانہ حب الوطنی کی آئینہ دار نظم "ہندوستاں" کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

ناقوس سے غرض ہے نہ مطلب اذاں سے ہے
مجھ کو اگر ہے عشق تو ہندوستاں سے ہے

تہذیب ہند کا ہیں چشمہ اگر ازل
یہ موج رنگ رنگ بپر آئی کہاں سے ہے

ذرے میں گر تڑپ ہے تو اس خاک پاک سے

سورج میں روشنی ہے تو اس آسماں سے ہے
ہے اس کے دم سے گرمیٔ ہنگامہ جہاں
مغرب کی ساری رونق اسی اک دکاں سے ہے [1]

پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی کو بھی ہندوستان سے بے پناہ محبت تھی ان کی خواہش تھی کہ تمام اہل وطن کے دل حب الوطنی کی روشنی سے منور ہو جائیں۔ نظم "صبح وطن" کی یہ دعا ملاحظہ ہو۔

یا خدا صبح وطن حب وطن ہو کے رہے
اور یہ حب وطن حب زمن ہو کے رہے
شیخ اور برہمن اک جان و دو تن ہو کے رہے
ثانی باغ ارم اپنا چمن ہو کے رہے
ہو بھی اس صبح کا گر دور تسلسل سے مآل
تو وہ تیرے کرم و فضل سے ہو شام وصال [2]

حب الوطنی سیاب اکبرآبادی کے لیئے جزو ایمان تھی۔ ان کی نظم "وطن" کے چند شعر درج کیے جاتے ہیں۔

---

[1] "بہارستان" ظفر علی خاں ص ۳۷۲

[2] "واردات" پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی ص ۱۶

وطن پیارے وطن تیری محبت جزو ایماں ہے
تو جیا ہے تو جو کچھ ہے سکون دل کا ساماں ہے
وطن میں تجھ کو جینا ہے وطن میں تجھ کو مرنا ہے
وطن پر زندگی کو ایک دن قربان کرنا ہے
وطن کی خاک سے اٹھا ہوں رنگیں پیرہن ہو کر
وطن کی خاک میں مل جاؤں گا خاک وطن ہو کر[1]

چکبست لکھنوی بھی جذبہ حب الوطنی سے سرشار تھے۔

جنون حب وطن کا مزا شباب میں ہے
لہو میں پھر یہ روانی رہے رہے نہ رہے[2]

چکبست ملک کے بچہ بچہ کو حب الوطنی سے سرشار کر دینا چاہتے تھے۔ انھوں نے بچوں میں حب الوطنی کے جذبات ابھارنے کے لیے نظم "ہمارا وطن دل سے پیارا وطن" لکھی۔

یہ ہندوستاں ہے ہمارا وطن محبت کی آنکھوں کا تارا وطن
ہمارا وطن دل سے پیارا وطن

---

[1] "ساز و آہنگ" سیماب اکبرآبادی ص ۳۱
[2] "صبح وطن" چکبست لکھنوی ص ۱۲۹

اسی سے ہے اس زندگی کی بہار وطن کی محبت ہو یا ماں کا پیار
ہمارا وطن دل سے پیارا وطن [1]

ان کی ایک اور نظم "وطن کو ہم وطن ہم کو مبارک" کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

یہ پیاری انجمن ہم کو مبارک یہ الفت کا چمن ہم کو مبارک
وطن کو ہم وطن ہم کو مبارک

یہاں کی خاک ہم کو کیمیا ہے یہ سونے سے بھی قیمت میں سوا ہے
وطن کو ہم وطن ہم کو مبارک [2]

احمق پھپھوندوی کے ہاں بھی وطن سے عقیدت اور محبت کے عکاس اشعار ملتے ہیں۔

سارے جہاں کی قیمت ہندوستاں ہمارا
یہ ہے اگر ہمارا سارا جہاں ہمارا [3]

جان و دل سے وطن و قوم پہ قرباں ہونا
ہے مسلماں کا حقیقت میں مسلماں ہونا [4]

۱، ۲ "صبح وطن"، چکبست لکھنوی ص ۵۴ - ۵۵

۳ "زندان حماقت"، احمق پھپھوندوی ص ۵۷

۴ "زندان حماقت"، احمق پھپھوندوی ص ۳۷

انھوں نے اپنے ہم وطنوں کو یہ درس دیا کہ وہ وطن کی خدمت جیسے عظیم مقصد کے لیے اپنی جانیں قربان کر دیں۔

جب موت ہے یقینی مرنا ہے جب مسلّم
پھر کیوں نہ جان دیں ہم خدمت گہ وطن میں [1]

خدمت ملک و وطن میں موت کا ڈر کیا مجھے
جانتا ہوں وہ تو آخر ایک بار آنے کو ہے [2]

حب الوطنی کے جذبہ سے سرشار مہاراج بہادر برق کو وطن عزیز کی خاک بھی جنت سے زیادہ عزیز تھی۔

مر کر ملی ہے چادر خاک وطن مجھے
مٹی نے اس زمیں کی دیا ہے کفن مجھے
عبادت کی گرد راہ ہے مشک ختن مجھے
جنت سے بھی عزیز ہے خاک وطن مجھے
مٹ مٹ کے گرد راہ وطن بن رہا ہوں میں
پیسے ہزار گردش چرخ کہن مجھے

---

[1] "زندان حماقت" احمق پھپھوندوی ص ۱۷

[2] "زندان حماقت" احمق پھپھوندوی ص ۵۷

اکسیر ہے نظر میں مری خاک پاک ہند
اجڑا ہوا دیار ہے فخر زمن مجھے
پیر تیری خاک سرمہ اہل نگاہ ہو
اے ہند پھر دکھا وہی شان کہن مجھے [1]

حالاں کہ ہر قوم کو اہل ہند میں علم و عمل کی کمی کا رنج تھا لیکن انھیں اس بات کا یقین تھا کہ ان کے ہم وطن چوں کہ جذبہ حب الوطنی رکھتے ہیں اس لیے انھیں دنیا میں جاہ و جلال ضرور ملے گا۔

کیا تھے اہل ہند یہ چرخ کہن سے پوچھ لو
یہ ہمالہ کی گپھاؤں کے دہن سے پوچھ لو
اپنا افسانہ لب گنگ و جمن سے پوچھ لو
پوچھ لو ہر ذرہ خاک وطن سے پوچھ لو

اپنے منہ سے کیا بتائیں ہم کہ کیا وہ لوگ تھے
نفس کش نیکی کے پتلے تھے مجسم لوگ تھے

ہم معترف ہوئے ان اوصاف سے پتی میں ہیں

---

[1] بحوالہ "ہندوستان کی جد وجہد آزادی میں اردو شاعری کا حصہ" ڈاکٹر درخشاں تاجور ص ۲۵۷

دولت علم و عمل کھو کر تہی دستی میں ہیں
شہرۂ آفاق اب پستی و بدمستی میں ہیں
شمع افسردہ کی صورت محفل ہستی میں ہیں
دور رفتہ کا مگر سودا ہمارے سر میں ہے
بادۂ حب وطن چھلکے ہوئے ساغر میں ہے

پھر یہیں ہوگا مسیر دہر میں جاہ و جلال
چار دن میں گلشن ہستی میں پھر ہوگے نہال
برق ہے ضرب المثل ہوگی ہمارے حب حال
"ہر کمالے را زوالے ہر زوالے را کمال"
نیر اقبال چمکے گا ہمارا ایک دن
اوج پر اس دیش کا ہوگا ستارا ایک دن [1]

تلوک چند محرومؔ نے بھی اہل ہند میں حب الوطنی کے پاکیزہ جذبہ کو پروان چڑھانے کی خواہش کی تھی۔ ان کے یہ اشعار ان کی حب الوطنی کو ظاہر کرتے ہیں۔

اہل جہاں! ابھرے سبھی سارے جہاں سے ہم

---

[1] "اردو میں قومی شاعری کے سو سال" مرتبہ علی جواد زیدی ص ۲۲۳

ہندی ہیں پیار کرتے ہیں ہندوستاں سے ہم
نقشِ زوال آج ہیں پستی کی خاک پر
رتبے میں تھے بلند کبھی آسماں سے ہم
بھولی نہیں ہے باغِ وطن کی بہار ابھی
اے دورِ اولیں! تجھے لائیں کہاں سے ہم
رنگِ زمانہ دیکھتے ہیں چونک چونک کر
صدیوں کے بعد جاگے ہیں خوابِ گراں سے ہم
ہوتا ہے لفظ لفظ سے دردِ وطن عیاں
محروم خوش ہوئے تیرے رنگِ بیاں سے ہم [1]

نظم "محبانِ وطن" میں محبانِ وطن کی مدح سرائی کرکے وطن سے اپنی والہانہ محبت کا اظہار کیا۔ نظم کے دو بند ملاحظہ ہوں

اونچی ہے بہت شانِ محبانِ وطن کی
ہے جانِ محبانِ وطن شانِ وطن کی
تقدیر کہیں حال پریشانِ وطن کی

---

[1] مضمون "میرے استاد" مصنفہ جمیلی سرشار مطبوعہ "نقوش" (لاہور) ستمبر ۱۹۶۷ء ص ۱۹۹

تنویر کہیں شمع شبستان وطن کی
یوں عشق وطن میں ہوئے تعمیر وطن کی
تقدیر جو ان کی ہے سو تقدیر وطن کی
ایثار کے پتلے ہیں خلوص ان کا ہے مذہب
راحت سے انھیں کام نہ آرام سے مطلب
روپوش جو ظلمت میں ہو امید کا کوکب
یہ چیر کے رکھ دیتے ہیں اک سو جگر شب
کر دیتے ہیں یوں مطلع انوار وطن کو
دکھلاتے ہیں امید کے آثار وطن کو[1]

جوش ملیح آبادی نے بھی وطن کی عظمت کے گیت گا کر اہل وطن میں حب الوطنی کا جوش پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ان کی نظم "وطن" ان کے جذبہ حب الوطنی کی ترجمان ہے۔

اے وطن اپاک وطن اروح روان احرار
اے کہ ذروں میں ترے بوئے چمن رنگ بہار
پائی غنچوں میں ترے رنگ کی دنیا ہم نے

---

[1] "کاروان وطن"، تلوک چند محروم ص ۱۸۶

تیرے کانٹوں سے لیا درس تمنا ہم نے

. . . . . .

پہلے جس چیز کو دیکھا وہ فضا تیری تھی
پہلے جو کان میں آئی، وہ صدا تیری تھی
اے وطن! آج سے کیا ہم تیرے شیدائی ہیں
آنکھ جس دن سے کھلی، تیرے تمنائی ہیں

. . . . . .

ہم زمیں کو تری ناپاک نہ ہونے دیں گے
تیرے دامن کو کبھی چاک نہ ہونے دیں گے
تجھ کو جیتے ہیں تو، غمناک نہ ہونے دیں گے
اپنی اکسیر کو یوں خاک نہ ہونے دیں گے
جی میں ٹھانی ہے یہی جی سے گذر جائیں گے
کم سے کم وعدہ یہ کرتے ہیں کہ مر جائیں گے [1]

نظم "اللہ کرے" سے بھی ان کی حب الوطنی کا اظہار ہوتا ہے۔

---

[1] "شعلہ و شبنم" جوش ملیح آبادی ص ۳۷ تا ۴۷

اے طاق وطن! تجھ میں اے کاش پریشاں ہو
وہ نور کہ غلطاں تھا قندیل سلیماں میں!!
اے کاش کبھی تیری ظلمت کی طرف دیکھے
وہ شمع کہ روشن ہے عشرت گہ نیرداں میں
ساقی کے تبسم سے اور جوش کے ہر ربط سے
روشن ہوں کنول تیری محراب زر افشاں میں [۱]

جوشؔ نے نظم "پیمان محکم" میں وطن سے یہ عہد کیا۔

قسم اس جوشؔ کی جو دوستی بنیں ابھارے گا
کہ اے ہندوستاں! جیسے ہی تو مجھ کو پکارے گا
مری تیغ رواں باطل کے سر پر جگمگائے گی
ترے ہونٹوں کی جنبش ختم بھی ہونے نہ پائے گی [۲]

افسرؔ میرٹھی کی متعدد نظمیں ان کی حب الوطنی کے جذبات کی عکاسی کرتی ہیں۔ ان کی ایک نظم "سارے جہان پر ہے سکہ مرے وطن کا" کے چند شعر پیش کیے جاتے ہیں۔

---

[۱] "شعلہ و شبنم" جوشؔ ملیح آبادی ص ۲۷-۳۷

[۲] "شعلہ و شبنم" جوشؔ ملیح آبادی ص ۱۳

پھولوں سے بھی سوا ہے کانٹا مرے وطن کا
ہے آفتاب مجھ کو ذرہ مرے وطن کا
دل میں جما ہوا ہے نقشہ مرے وطن کا
تاتاریوں نے اس پر اپنا قدم جمایا
مغلوں نے چھاؤنی کی ترکوں نے گھر بنایا
سارے جہان پر ہے سکہ مرے وطن کا [1]

ساغر نظامی نے اپنی حب الوطنی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا۔

وقت آئے گا کہ پھولوں سے سجا دیں گے تجھے
وقت آئے گا کہ ہم دلہن بنا دیں گے تجھے
خون کے چھینٹوں سے رنگ ارتقا دیں گے تجھے
گود میں لے کر ثریا پر بٹھا دیں گے تجھے
نغمہ ہندوستاں گونجے گا ساز عرش تک
چوٹیاں ہوں گی ہمالہ کی فراز عرش تک

اب ہمارے ہاتھ ہیں تیری حفاظت کے لیئے
اب ہمارا خون ہے تیری حمایت کے لیئے

---

[1] "پیام روح" حامد اللہ افسر ص ۱۱۸ - ۱۱۹

روح اب تیار ہے احساس غیرت کے لیئے
اے وطن اب وقف ہیں ہم تیری خدمت کے لیئے
کر چکے ہیں عزم راسخ آج اپنے دل میں ہم
صدر محفل بن کے بیٹھیں گے تری محفل میں ہم
تیرے حامی ہیں بہت غم خوار تیرے اے وطن
اے وطن! ہیں جوش میں سرشار تیرے اے وطن
خون سے سینچیں گے برگ و بار تیرے اے وطن
خود بنیں گے خادم و دلدار تیرے اے وطن
ٹوٹ سکتا ہے بہار مستی گلزار کون؟
ہم ابھی زندہ ہیں ہو سکتا ہے پھر حقدار کون؟[1]

ان کی نظم "عہد" سے ہندوستان سے ان کی بے پناہ محبت کا اظہار ہوتا ہے۔

جب طلائی رنگ سکوں کو بچایا جائے گا
جب مری غیرت کو دولت سے لڑایا جائے گا
جب رگ افلاس کو میری دبایا جائے گا

---

[1] "بادہ مشرق" حصہ اول جلد اول ساغر نظامی ص ۲۵-۲۶

اے وطن اس وقت بھی میں تیرے نغمے گاؤں گا
اور اپنے پاؤں سے انبار زر ٹھکراؤں گا
جب مجھے پیڑوں سے عریاں کر کے باندھا جائے گا
گرم آہن سے مرے ہونٹوں کو داغا جائے گا
جب دہکتی آگ پر مجھ کو لٹایا جائے گا
اے وطن اس وقت بھی میں تیرے نغمے گاؤں گا
تیرے نغمے گاؤں گا اور آگ پر ہو جاؤں گا
گولیاں چاروں طرف سے گھیر لیں گی جب مجھے
اور تنہا چھوڑ جائے گا مرا مرکب مجھے
اور سنگینوں پہ چاہیں گے اٹھانا سب مجھے
اے وطن اس وقت بھی میں تیرے نغمے گاؤں گا
مرتے مرتے اک تماشائے وفا بن جاؤں گا [1]

آنند نرائن ملا نے بھی وطن سے اپنی محبت کا اظہار کیا ہے۔ نظم "محبان وطن کا نعرہ" سے ان کی حب الوطنی کا اظہار ہوتا ہے۔ چند اشعار درج کیے جاتے ہیں۔

---

[1] "بادہ مشرق" حصہ اول جلد اول ساغر نظامی ص ۱۰۱

شہید جور گلچیں ہیں اسیر و خستہ تن ہم ہیں
ہمارا جرم اتنا ہے ہوا خواہ چمن ہم ہیں
ستانے کو ستالے آج ظالم جتنا جی چاہے
مگر اتنا کہے دیتے ہیں فدائے وطن ہم ہیں
ہمارے ہی لہو کی بو صبا لے جائے گی کنعاں
ملے گا جس سے یوسف کا پتہ وہ پیرہن ہم ہیں
سلالے گی ہمیں خاک وطن آغوش میں اپنی
نہ فکر گور ہے ہم کو نہ محتاج کفن ہم ہیں
فدائے ملک ہونا حاصل قسمت سمجھتے ہیں
وطن پر جان دینے ہی کو ہم جنت سمجھتے ہیں
ہمارے شوق کی وارفتگی ہے دید کے قابل
لہو بہتی ہے اگر ایذا اسے راحت سمجھتے ہیں
وطن کا ذرہ ذرہ ہم کو اپنی جاں سے پیارا ہے
نہ ہم مذہب سمجھتے ہیں نہ ہم ملت سمجھتے ہیں
حیات عارضی صدقے حیات جاودانی پر
فنا ہونا ہی اب اک زیست کی صورت سمجھتے ہیں

ہمیں معلوم ہے اچھی طرح تاب جفا تیری
مگر اس سے سوا اپنی حد اُلفت سمجھتے ہیں
دکھانا ہے کہ لڑتے ہیں جہاں میں باوفا کیوں کر
نکلتی ہے زباں سے زخم کھا کر مرحبا کیوں کر [۱]

حفیظ الرحمٰن حفیظ بھی حب الوطنی کے جذبہ سے سرشار تھے اور وہ اسی جذبہ کو تمام اہل وطن کے دلوں میں موجزن کر دینے کے خواہش مند تھے۔

دل وہ دل ہی نہیں جس دل میں نہ ہو دردِ وطن
سر وہ سر ہی نہیں جو قوم پہ قرباں نہ ہوا [۲]

پنڈت رام نرائن تر پاٹھی کی حب الوطنی ملاحظہ ہو۔

اس نے سمجھا ہی نہیں حب وطن کیا شئے ہے
جیل میں آ کے جو سرکار کا مہماں نہ ہوا [۳]

ڈاکٹر لکشمی دت مسافر نے حب الوطنی کے جوش میں وطن کے نام پر خود کو مٹا کر خاک میں مل جانے کا لب الحین اہل وطن کے سامنے

---

[۱] "جوئے شیر" آئینہ نرائن ملا ص ۵۱ - ۵۲

[۲،۳] بحوالہ "مشاعرہ زنداں" مطبوعہ اتر پردیش اردو اکیڈمی لکھنؤ ص ۳۷ - ۳۸

پیش کیا۔

وطن کے نام پر خود کو مٹا کر خاک میں مل جا
فلک پر نام روشن کر، زمیں پر بے نشاں ہو کر [1]

جذبہ آزادی کے اس دور میں اردو شعراء نے اپنے ہم وطنوں میں حب الوطنی کے جذبات کو فروغ دینے کے لیئے ہندوستانیوں کو محکومی کی ذلتوں اور آزادی کی وقعتوں کا احساس بھی دلایا۔ برطانوی حکومت کے مظالم پر کھل کر برہمی کا اظہار کر کے غلامی کی زنجیروں کو توڑ ڈالنے کی انھیں تلقین کی۔ اور ان کے ذہن و دل میں جوش بغاوت کا طوفان اٹھا کر حصول آزادی کی راہ میں آنے والی ہر قسم کی صعوبتوں کو برداشت کرنے کا حوصلہ دیا۔

ظفر علی خاں نے وطن کو آزاد ہونے کی صورت میں جنت اور غلامی کی حالت میں جہنم قرار دیا۔

اگر ہم آزاد ہیں تو جنت غلام اغیار ہیں تو دوزخ
یہ جاں سے پیارا وطن ہمارا بہشت بھی ہے جحیم بھی ہے [2]

---

[1] بحوالہ "مشاعرہ زنداں" مطبوعہ اتر پردیش اردو اکیڈمی لکھنؤ ص ۵۷

[2] "بہارستان" ظفر علی خاں ص ۱۶۴

ایک اور شعر ملاحظہ ہو۔

ہندوستاں غلام ہے آزاد کر اسے
تلقین کر رہا ہے یہی ہر وطن پرست [۱]

وحید الدین سلیم نے بھی اپنے ہم وطنوں کو حصول آزادی کی راہ میں آنے والی مصیبتوں کو برداشت کرنے کا درس دیا۔

اگر آزادی ہندوستاں پنہاں ہے جیلوں میں
تو ہے مشتاق ہر ہندی در و دیوار زنداں کا
کبھی روکے سے رکتا ہے کہیں یہ جذب آزادی
دبانے سے بھڑک اٹھتا ہے شعلہ آہ سوزاں کا [۲]

سیماب نے بھی غلامی اور محکومی کے خلاف آواز بلند کی اور اپنے ہم وطنوں کو آزادی کی قدر و قیمت سے روشناس کرایا۔ نظم "آزادی" ملاحظہ ہو۔

وہ اک خود مجسم، صد بہار و صد چمن در بر
نشاط دو جہاں در دل، حیات انجمن در بر

---

[۱] "بہارستان" ظفر علی خاں ص ۱۵۱م

[۲] "افکار سلیم" مرتبہ شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی ص ۱۶۸

خلشِ گُل کی جگر میں اور دل میں دردِ لالہ کا
ادھر اک ہاتھ میں مسجہ، ادھر گنبد شوالے کا
غریبوں اور مزدوروں سے ہنس کر بولنے والی
یتیموں اور بیواؤں کے عقدے کھولنے والی
مساوات و رواداری کے جذبے پاک چتون میں
وفاداری و دلداری کے نقشے چلبلے پن میں
فضا کی وسعتوں میں اڑنے والی اک ردا سر پر
ادائیں تیرنے والی ہواؤں کے سمندر پر
تعجب اور تفکر کے لہو سے دست پا رنگیں
وفا کے رنگ سے ہر عشوہ رنگیں ہر ادا رنگیں
تنفس میں نجات اس کے ترنم میں حیات اس کے
تکلم گلستاں اس کا، جلو میں کائنات اس کے
سکوں ہر سانس کا اس کے تبسم سے محبت کا
شگفتہ تیوروں میں موجزن دریا صداقت کا
شعاعِ حسن لرزاں اس کے فردوسی لشاروں میں
بہار افروز پھولوں میں، صباحت دیر تاروں میں

زمین و آسماں اس کے حریم ناز کے آنگن
مہ و خورشید سے اس کی بساط انجمن روشن
چمن اس کے بیاباں اس کے، کوہ و آبشار اس کے
سمندر اس کے، میداں اس کے انہار و دیار اس کے
وہ فطرت سے براہ راست رشتہ جوڑنے والی
غلامی اس کے پائے ناز پر دم توڑنے والی
وہ شہزادی ہے، میں اس کی محبت کا پجاری ہوں
وہ آزادی کی دیوی اور میں اس کا پجاری ہوں [1]

سیماب اکبرآبادی شدت سے متمنی تھے کہ ان کا وطن غلامی کی زنجیروں سے نجات حاصل کرلے۔ "اے جوانان وطن" میں انھوں نے نوجوانوں کو تلقین کی کہ وہ غلامی کی زنجیروں کو توڑ دیں۔

بڑھ کے آگے دوری منزل کا اندازہ کرو
اضطراب و گرمی محفل کا اندازہ کرو
کھول کر آنکھیں حق و باطل کا اندازہ کرو
آنے والی ہر نئی مشکل کا اندازہ کرو

---

[1] "کارامروز" سیماب اکبرآبادی ص ۳۶ - ۳۷

امتحاں لینے کو ہے دورِ پریشاں وطن

اے جوانانِ وطن!

سوچ لو آزاد ہو جانے کی تدبیریں تمام

جمع کر لو ذہن میں رفعت کی تنویریں تمام

پھینک دو ہاتھوں سے مایوسی کی تصویریں تمام

کھول دو پائے وطن سے آج زنجیریں تمام

توڑ دو بندِ غلامی اے غلامانِ وطن

اے جوانانِ وطن! [1]

نظم "خوابِ آشنائے جمود سے" میں سیماب نے لوگوں سے مخاطب ہو کر تحریکِ آزادی میں شامل ہونے کی تلقین کی۔

جوانانِ وطن میں اک تڑپ اک جوش پیدا ہے

گلستانِ وطن کا پتہ پتہ چونک اٹھا ہے

بیابانِ وطن کا ذرہ ذرہ شعلہ برپا ہے

مگر اب تک جو دو کل ہی میں مبتلا ہے تو

ارے کیا سو رہا ہے تو؟! [2]

---

[1] "ساز و آہنگ" سیماب اکبر آبادی ص ۵۳ - ۵۴

[2] "ساز و آہنگ" سیماب اکبر آبادی ص ۷۲ - ۷۳

احقؔ پھپھوندوی نے بھی ہندوستانیوں کو آزادی ملک کے لیئے ہر قسم کی تکالیف برداشت کرنے اور اس کے لیئے اپنی جان قربان کر دینے کی تلقین کی۔

وطن پر جان دے دے حریت پر سر فدا کر دے
جو انساں ہے تو پھر انسانیت کا حق ادا کر دے [۱]

جیل خانوں سے دل احرار گھبرائے گا کیا
یہ تو گھر ہیں پیروان سنت سجاد کے [۲]

ہم ہر طرح کی تجھ پر قربانیاں کریں گے
آزاد تجھ کو لیکن ہندوستاں کریں گے [۳]

جوشؔ ملیح آبادی نے بھی اپنے ہم وطنوں میں حصول آزادی کا شعور بیدار کرنے کے لیئے انھیں محکومی کا احساس دلایا۔ نظم "مستقبل کے غلام" کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

یہ ہند کے سمن بر شیریں کلام بچے

---

[۱] "زندان حماقت" احقؔ پھپھوندوی ص ۲۸
[۲] "زندان حماقت" احقؔ پھپھوندوی ص ۴۹
[۳] "زندان حماقت" احقؔ پھپھوندوی ص ۴۷

یہ گلعذار بچے یہ لالہ فام بچے
کس شان دلکشی سے پھرتے ہیں شور کرتے
یہ گنگناتے غنچے، یہ بولتے شگوفے
لیکن وطن کی حالت پیہم دُرا رہی ہے
دل سے یہ روح فرسا آواز آ رہی ہے
اک دن "ذلیل" و "وحشی" ان کے بھی نام ہونگے
اپنی ہی طرح اک دن یہ بھی غلام ہونگے [1]

نظم "غلاموں سے خطاب" میں بھی انھوں نے اہل ملک کو بڑے ہی تلخ لہجہ میں خطاب کر کے محکومی کی حالت میں رہنے پر شرم دلائی۔

چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

تجھ پر مرے کلام کا ہوتا نہیں اثر
چونکا رہا ہوں کب سے میں شانے جھنجھوڑ کر
اکسائے میرا شعر اگر جذبہائے جنگ
پیدا ہو آبگینے کے اندر مزاج سنگ
خرمن میں میرا شعر اگر کج کرے کلاہ

---

[1] "شعلہ و شبنم" جوش ملیح آبادی ص ۶۷

خس تند بجلیوں سے لڑانے لگے نگاہ
آہن کے جوہروں سے ٹپکنے لگے شراب
پیری کی ہڈیوں میں مچلنے لگے شباب
تجھ کو یقیں نہ آئے گا اے دائمی غلام
میں جا کے مقبروں میں سناؤں اگر کلام
خود موت سے حیات کے چشمے ابل پڑیں
قبروں سے سر کو پیٹ کے مردے نکل پڑیں
میرے رجز سے لرزہ بر اندام ہے زمیں
افسوس تیرے کان پہ جوں رینگتی نہیں
تو چپ رہا، زمین ہلی، آسماں ہلا
تجھ سے تو کیا خدا سے کروں گا میں یہ گلا
ان بزدلوں کے حسن پہ شیدا کیا ہے کیوں
نامرد قوم میں مجھے پیدا کیا ہے کیوں؟ [1]

اپنے ہم وطنوں میں جد و جہد آزادی کے جذبہ کو فروغ دینے اور انھیں آزادی کی قدر و قیمت سے روشناس کرانے کے لیے انھوں نے

---

[1] "شعلہ و شبنم" جوش ملیح آبادی ص ۱۴

ایک شعر میں فرمایا

سنو اے بستگانِ زلفِ گیتی ندا کیا آ رہی ہے آسماں سے
کہ آزادی کا اک لمحہ ہے بہتر غلامی کی حیاتِ جاوداں سے [1]

جوشؔ کے دل میں آزادی ہندوستان کی شدید تڑپ تھی۔ ان کی نظم "سجاد" سے۔ اگر بد رفتند، پسر تمام کنند" میں انھوں نے اپنے بیٹے کو مخاطب کر کے کہا

قبر میں روحِ پدر کو شاد کرنے کے لیئے
سر کٹانا ہند کو آزاد کرنے کے لیئے
باپ کی سوئی ہوئی قسمت جگانے کے لیئے
قبر پر دو پھول لے آنا چڑھانے کے لیئے
باغِ ہستی کے نہ وہ باغِ جناں کے پھول ہوں
مژدۂ آزادیِ ہندوستاں کے پھول ہوں [2]

جمیلؔ مظہری نے بھی کاروانِ جدوجہدِ آزادی کو منزلِ مقصود تک پہنچانے کے لیئے ہر سرپیکار نوجوانوں کو مخاطب کر کے ان میں

---

[1] "شعلہ و شبنم" جوشؔ ملیح آبادی ص ۶۵
[2] "شعلہ و شبنم" جوشؔ ملیح آبادی ص ۱۱۸

جوش و ولولہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ان کی نظم "نالہ جرس" (نوجوانان ہند کے لیئے) کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

جھکے نہ ہند کا نشاں بڑھے چلو بڑھے چلو
عمل کے رازداں ہو تم جواں ہے دل جواں ہو تم
جواں تمہارے حوصلے، جواں تمہارے ولولے
تمہاری قوتیں جواں بڑھے چلو بڑھے چلو
جھکے نہ ہند کا نشاں بڑھے چلو بڑھے چلو
نہیں مآل زندگی مگر سوائے خدمت
یہ ہے سوال زندگی نہ لو بجائے خدمت
ملے جو عمر جاوداں بڑھے چلو بڑھے چلو
جھکے نہ ہند کا نشاں بڑھے چلو بڑھے چلو [1]

اس طرح بحیثیت مجموعی اس دور میں (۱۹۱۶ - ۱۹۳۶) اردو شاعری نے ہندوستان کی جدوجہد آزادی کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس دور میں شعراء نے سیاسی تحریکات کو اپنی شاعری میں سمو کر انھیں تیز سے تیز تر کرنے میں

---

[1] ماہنامہ "نگار"، (لکھنو) جون ۱۹۲۱ء ص ۸۵

مدد دی اور غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے عوام کے خوابیدہ شعور کو جھنجھوڑ کر انھیں جنگ آزادی میں شریک ہونے کی ترغیب دلائی۔ اور ان کے دلوں میں اتحاد و یکجہتی، حب الوطنی، اور سر فروشی کا جذبہ ابھار کر ان کو ملک کی آزادی کے لیئے مر مٹنے پر آمادہ کیا۔

۱۹۳۵ء میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے اعلان سے ہندوستان کی جد وجہد آزادی کو ایک نیا موڑ ملا۔ ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۷ء تک جو سیاسی واقعات رونما ہوئے انھوں نے جد وجہد آزادی کی تحریک کو اپنے عروج پر پہنچا دیا۔ اردو شعراء نے اس دور میں ایسی پر جوش اور ولولہ انگیز نظمیں لکھیں جنھوں نے اس دور میں ابھرنے والی تحریکوں کو توانائی بخشنے اور اہل ہند میں حب الوطنی کی روح پھونک کر رفتار آزادی کو تیز تر کرنے اور ان میں برطانوی حکومت سے نبرد آزما ہونے کے لیئے جوش و بغاوت کے جذبات کو تیز کر کے وطن عزیز کے خواب آزادی کو اس کی تعبیر سے ہمکنار کیا۔

ہندوستانیوں نے اس نئے قانون کو جو اگست ۱۹۳۵ء

میں پاس ہوا اور یکم اپریل ۱۹۳۷ء کو نافذ کیا گیا ناقابل قبول ٹھہرا کر اس کی مذمت اور مخالفت کی۔ اردو شاعری میں بھی اس ایکٹ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی گئی۔

ظفر علی خاں نے اس کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے اپنی ایک نظم میں فرمایا

صدر اعظم کی سخاوت میں نہیں ہم کو کلام
لیکن ان سے پوچھتے ہیں ہم کہ ہم کو کیا دیا
کاغذی گھوڑا دیا ہم کو سواری کے لیے
اک کھلونا بھیج کر بچوں کا دل بہلا دیا
میوہ خوری کے لیے چننے لگے جب گول میز
رکھ لیا خود مغز پھلکوں پر ہمیں مُرغا دیا [1]

جوش ملیح آبادی نے نظم "وفاق" کہہ کر ۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے فریب سے ہندوستانیوں کو باخبر کرایا۔

دھوم میں مچی ہوئی ہیں نظام وفاق کی
ہندوستاں ہنوز ظلوم و جہول ہے

---

[1] "نگارستان" مولانا ظفر علی خاں ص ۲۱۸

اس نوحۂ خزاں کو سمجھنا نوید گل
اک بے پناہ چوک ہے اک سخت بھول ہے
یہ بوستان اہل سیاست کی شاخ گل
شیطاں کے پائیں باغ کی سوکھی ببول ہے
ہشیار اہل ہند کہ پھر اس زمین پر
گردوں سے ایک تازہ بلا کا نزول ہے
ناداں اکڑ رہے ہیں کہ حاصل ہوا وفاق
دانا سمجھ رہے ہیں کہ اپریل فول ہے [1]

نئے آئین کے مطابق ۳۷-۱۹۳۶ء میں ہونے والے صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات میں کانگریس پارٹی نے شاندار کامیابی حاصل کی۔ بنگال، پنجاب اور سندھ کے علاوہ سبھی صوبوں میں اکثریت حاصل کرنے کی بناء پر کانگریس پارٹی کو یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ اپنی وزارتوں کی تشکیل کرے[2]۔ لیکن اس نے اس وقت تک

---

[1] "حرف وحکایت" جوش ملیح آبادی ص ۱۲۸-۱۱۲۹

[2] رام گوپال کی انگریزی کتاب How India Struggle for Freedom کا ہندی ترجمہ بھارتیہ سوتنترتا سنگرام کا اتہاس مترجمہ گیان چند جین ص ۴۰۴

وزارتیں قبول کرنے سے انکار کر دیا جب تک کہ اسے یہ یقین نہ دلایا جائے کہ گورنر وزیرہ کی آئینی کاروائیوں میں دخل اندازی نہیں کریں گے۔[1] برٹش حکمرانوں نے شروع میں تو کانگریس سے کسی قسم کا معاہدہ کیئے بغیر غیر کانگریسی وزارتیں بنالی تھیں لیکن کچھ عرصہ بعد جب جون ۱۹۳۷ء میں وائسرائے نے اپنے بیان میں کانگریس پارٹی کو یہ یقین دلایا کہ گورنر وزیرہ کی آئینی کاروائیوں میں مداخلت نہیں کریں گے تو اس نے وزارت بنانا منظور کر لیا۔ اور سات صوبوں شمال مغربی سرحدی صوبے صوبہ متحدہ، صوبہ متوسط، بہار، اڑیسہ، مدراس اور بمبئی میں اپنی وزارتوں کی تشکیل کی۔ کانگریس کی یہ صوبائی وزارتیں بہت زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکیں۔ ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم کے سلسلے میں کانگریس کے برطانوی حکومت سے اختلافات ہو گئے اور اسی بناء پر تمام صوبائی وزارتوں نے استعفےٰ دے دیئے۔

اسی دوران کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان خلیج اس قدر بڑھ

---

[1] رام گوپال کی انگریزی کتاب How India Struggle for Freedom کا ہندی ترجمہ "بھارتیہ سوتنترتا سنگرام کا اتہاس" مترجم گیان چند جین ص ۴۰۴

چکی تھی کہ کانگریسی وزارتوں کے مستعفی ہونے پر مسلم لیگ نے ۲۲/دسمبر ۱۹۳۹ء کو ملک میں یوم نجات منایا۔ کانگریس اور مسلم لیگ کی کشاکش کی وجہ کانگریس کی وہ غلطی تھی جو وزارتوں کی تشکیل کے دوران صوبہ متحدہ میں سرزد ہوئی تھی۔ کانگریس نے مسلم لیگ سے انتخابی سمجھوتہ کرنے کے باوجود اس کے ممبران کو کابینہ میں شامل نہیں کیا۔ اس معاملے پر دونوں جماعتوں میں بدمزگی پیدا ہو چکی تھی پھر جب مسلم لیگ نے یوم نجات منانے کا فیصلہ کیا تو اس فیصلے نے تلخیوں کو کچھ اور بڑھا دیا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں سیاسی تفریق پسندی کا رجحان بڑھنے لگا اور اسی مسلم لیگ نے جو چند سال قبل کیمبرج یونیورسٹی کے کچھ طلباء کی تقسیم ہند اور قیام پاکستان کی تجویز کو رد کر دیا تھا مارچ ۱۹۴۰ء کے اپنے سالانہ اجلاس میں تقسیم کی قرارداد کو منظور کر لیا۔ ایک طرف مسلم لیگ علیحدگی کی تحریک کو پرزور بنانے کے لیے سرگرم تھی تو دوسری طرف قوم پرور جماعتیں ملک کے اتحاد اور سالمیت کو برقرار رکھنے کے لیے کوشاں تھیں۔

۲۳/مارچ ۱۹۴۲ء کو جب کہ دوسری جنگ عظیم

جاری تھی سر اسٹیفورڈ کرپس ایک اسکیم لے کر ہندوستان آئے جس میں ہندوستانی رہنماؤں سے سمجھوتے اور انھیں حکومت اور جنگی سرگرمیوں میں شامل کرنے کی تجویز تھی۔ "کرپس اسکیم" کو ملک کی تمام جماعتوں نے مسترد کر دیا۔ کرپس مشن کی ناکامی کے بعد گاندھی جی نے اہل ہند کو صلاح دی کہ وہ انگریزوں سے اپنی پوری طاقت سے کہیں کہ "ہندوستان چھوڑ دو"۔ چناں چہ ہندوستان چھوڑو کی قرارداد ۸/ اگست ۱۹۴۲ء کو بمبئی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے تاریخی اجلاس میں منظور ہوئی۔ اس تحریک سے ملک میں بغاوت کا ایسا طوفان اٹھ کھڑا ہوا جس نے انگریزی حکمرانوں کو ہراساں کر دیا۔ تحریک کو کچلنے کے لیے ان کی تمام ظالمانہ کارروائیاں بالکل لاحاصل ثابت ہوئیں۔

شمیم کرہانی کی نظم "طوفان" میں اس تحریک کی طوفانی صورت کو بڑے والہانہ انداز سے لبیک کہا گیا۔

لو آج وہ طوفاں آ ہی گیا

تھی آس ہمیں جس طوفاں کی، لو آج وہ طوفاں آ ہی گیا

مظلوم کی آہوں کا بادل، ظالم کے جہاں پر چھا ہی گیا

پربت سے راس کماری تک خونیں پرچم لہرا ہی گیا
لو آج وہ طوفاں آ ہی گیا

او مست جوان دیر نہ کر بڑھ اور قدم لے طوفاں کے
یہ میل تباہی سینچے گی، سوکھے ہوئے گلشن انساں کے
جو سکھ کا سویرا لائے گا وہ دکھ کا اندھیرا آ ہی گیا
لو آج وہ طوفاں آ ہی گیا[1]

ہندوستانیوں نے اس تحریک میں جس جوش و خروش اور ہمت کے ساتھ حصہ لیا تھا اس کی عکاسی ان کی نظم "فوجی لاری" کرتی ہے۔

یہ فوج کی لاری جاتی ہے
میدان میں ہمت کے پتلے، تیار کھڑے ہیں مرنے کو
اک قوم دبی کچلی ہاری، پستی سے تلی ہے ابھرنے کو
ہر جسم "ذرہ" سے بے پروا ہر ہاتھ "تبر" سے خالی ہے
آنکھوں میں نشہ ہے مرنے کا، چہروں پہ خوشی کی لالی ہے
ان موت سے لڑنے والوں کو "تلوار" ڈرانے جاتی ہے

---

[1] "روشن اندھیرا" شمیم کرہانی ص ۱۷ - ۱۸

چھوٹی سی جماعت ہے لیکن جب کھاؤ جگر پہ کھائے گی
جو بوند لہو کی ٹپکے گی وہ بوند چمن بن جائے گی
ان زندہ گھروں کی بربادی پیغام ہے اک آبادی کا
ان کے ہی لہو سے ابھرے گا رنگین پرچم آزادی کا
خود موت ہماری ہستی کا پرچم لہرانے جاتی ہے
یہ فوج کی لادی جاتی ہے[1]

ملک میں برطانوی حکومت کے خلاف نفرت کی لہر پھیلانے میں قحط بنگال (۱۹۴۳ء) نے بھی بڑی مدد کی جس کے لیے بڑی حد تک حکومت برطانیہ ہی ذمہ دار تھی۔ اردو کے متعدد شعراء نے قحط بنگال کے موضوع پر پر اثر نظمیں کہہ کر ہندوستانیوں کو خطۂ بنگال کی تباہی سے آگاہ کرایا اور انھیں یہ جتلایا کہ یہ قحط انگریزوں کی پالیسیوں اور لاپرواہیوں کا نتیجہ ہے۔ انھوں نے اپنے ہم وطنوں کو یہ درس دیا کہ اپنے ملک کو قحط اور دیگر آفات سے بچانے کے لیے ضروری ہے کہ وہ سب سے پہلے طوق غلامی اتار پھینکیں۔

تلوک چند محروم نے اپنی ایک نظم میں قحط بنگال

---

[1] "روشن اندھیرا" شمیم کرہانی ص ۲۱-۲۲

کا افسانہ عبرت سنا کر اپنے ہم وطنوں کو خبردار کیا کہ غلامی کی زنجیر نہ ٹوٹنے کی صورت میں انھیں اس سے بھی خطرناک صورت حال سے دوچار ہونا پڑ سکتا ہے۔

اے مست مئے بے خبری، حال جہاں دیکھ
سرحد فنا ہے یہی، پہنچا ہے کہاں، دیکھ
خونخوار بلائیں ہیں ترے سامنے، غافل
قحط اور وبائیں ہیں ترے سامنے غافل
کیا اہل وطن کا تجھے غم کچھ بھی نہیں ہے
بنگال کے مٹنے کا الم کچھ بھی نہیں ہے
افسانہ عبرت ہوئی ویران بنگال
مذکور کہن ہے چمنستان بنگال
سڑتی ہیں پڑی کوچہ و بازار میں لاشیں
ہیں نقش طرب دیدۂ اغیار کی لاشیں
سفاک بہت خوش ہیں تباہی پہ ہماری
یہ جور ہے ناکردہ گناہی پہ ہماری
بنگلم کے ترانوں کا وطن نالاں کناں ہے

ٹیگور کے نغموں کا چمن وقف خزاں ہے
جس خطہ سے اٹھی تھی صدا حب وطن کی
ملتی ہے اسے آج سزا حب وطن کی
لوٹا نہ اگر حلقۂ زنجیر غلامی
اس سے بھی خطرناک ہے تقدیر غلامی [1]

بنگال کے قحط پر جگر مراد آبادی نے بھی اپنے تاثرات نظم کیے ان کی نظم "قحط بنگال" کے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

بنگال کی میں شام و سحر دیکھ رہا ہوں
ہر چند کہ ہوں دور مگر دیکھ رہا ہوں
افلاس کی ماری ہوئی مخلوق سر راہ
بے گور و کفن خاک بسر دیکھ رہا ہوں
تعمیر کے پردے میں یہ انداز ہے حکومت
تخریب بہ عنوان دگر دیکھ رہا ہوں
ہر چند کہ آثار تو کچھ اور ہیں لیکن
ایک خیر بھی در پردہ شر دیکھ رہا ہوں

---

[1] "کاروان وطن" تلوک چند محروم ص ۲۵۶-۲۵۷

صیاد نے لوٹا تھا عنادل کا نشیمن
صیاد کا لٹتے ہوئے گھر دیکھ رہا ہوں
ارباب وطن کو مری جانب سے ہو مژدہ
اغیار کو مجبور سفر دیکھ رہا ہوں
جو خواب کہ شرمندۂ تعبیر تھا اب تک
اس خواب کی تعبیر جگر دیکھ رہا ہوں [1]

آنند نرائن ملا نے بھی نظم "قحط کلکتہ" لکھی - چند بند ملاحظہ ہوں۔

خاک بنگال میں اب بھی ہے وہی ہریالی
اب بھی گھر گھر کے برستی ہیں گھٹائیں کالی
کیا قیامت ہے وہی جس نے یہ کھیتی پالی
اس کے حصہ میں نہیں ایک بھی سوکھی بالی
وہ حکومت کی فروزت کہ ٹھکانہ ہی نہیں
اور بے چارے کسان کے لیئے دانہ بھی نہیں [2]

---

[1] "آتش گل" جگر مراد آبادی ص ۱۹۸- ۱۹۹
[2] "جوئے شیر" آنند نرائن ملا ص ۲۶۲

علی سردار جعفری نے بھی اپنے ہم وطنوں کو بنگال کی ابتری کا احساس دلایا۔

جس افق سے روز ہوتا ہے طلوع آفتاب
جس نے پالی اپنے گہوارے میں روح انقلاب
جس کے فرزندوں نے دی تحریک آزادی کو آب
جس حسیں وادی میں شادابی بجاتی تھی رباب
آج اس میں قحط ہے آلام ہیں ادبار ہے
زندگی سے آج اس کا ہر نفس بیزار ہے

بستیوں میں گاؤں میں شہروں میں لہراتی ہے موت
جس طرف دیکھو اسی جانب نظر آتی ہے موت
چھین کر بچوں کو ماؤں سے لیے جاتی ہے موت
سرنگوں ہے زندگی اور ناز فرماتی ہے موت
گاؤں ویراں ہو گئے، ہر جھونپڑا سنسان ہے
خطۂ بنگال ہے یا ایک قبرستان ہے[1]

کیفی اعظمی نے نظم "کلکتہ" میں بنگال کے قحط کی تصویر کشی اس

---

[1] "نغمہ دوراں" مرتبہ غلام ربانی تاباں ص ۲۲-۲۳

طرح کی ہے۔

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے
رستوں پہ رینگتے ہوئے بھوکے ہزار حیف
غربت کا جاں گداز نظارہ کہ ہائے ہائے
وہ خاک پر بلکتے ہوئے طفل جاں بہ لب
وہ ڈوبتا ہر ایک کا ستارا کہ ہائے ہائے
بچے، جوان، عورتیں بے آس ہیں سبھی
آرام اس طرح سے سدھارا کہ ہائے ہائے
سڑکوں پہ وہ پڑی ہوئی بھوکوں کی میتیں
لاشوں سے پٹ رہا ہر ایک کا کنارہ کہ ہائے ہائے
ہوتی ہوئی تباہ وہ گنجان بستیاں
چڑھتا ہوا وہ قحط کا دھارا کہ ہائے ہائے
انساں ترس رہے ہیں نوالے کے واسطے
جینے کا یوں مٹا ہے سہارا کہ ہائے ہائے
وہ قحط و بے کسی وہ حکومت کی بے حسی

وہ تاجران مست و خود آرا کہ ہائے ہائے
کہیں تڑپ اٹھی ہیں وطن کی جماعتیں
بھوکوں نے اس طرح سے پکارا کہ ہائے ہائے [1]

ساحر لدھیانوی نے بھی نظم "بنگال" میں اپنے احساسات بیان کیے۔

جہاں کہنہ کے مفلوج فلسفہ والو!
نظام نو کے تقاضے سوال کرتے ہیں
یہ شاہراہیں اسی واسطے بنی تھیں کیا
کہ ان پہ دیس کی جنتا سسک سسک کے مرے
زمیں نے کیا اسی کارن اناج اگلا تھا؟
کہ نسل آدم و حوا بلک بلک کے مرے
ملیں اسی لیے ریشم کے ڈھیر بنتی ہیں
کہ دختران وطن تار تار کو ترسیں
چمن کو اس لیے مالی نے خوں سے سینچا تھا
کہ اس کی اپنی نگاہیں بہار کو ترسیں
زمیں کی قوت تخلیق کے خداوندو!

---

[1] "غم دوراں" مرتبہ غلام ربانی تاباں ص ۳۳-۳۴

ملوں کے منتظمو! سلطنت کے فرزندو!

پچاس لاکھ فسردہ گلے سڑے ڈھانچے
نظامِ زر کے خلاف احتجاج کرتے ہیں
خموش ہونٹوں سے دم توڑتی نگاہوں سے
بشر بشر کے خلاف احتجاج کرتے ہیں [1]

اس طرح مختلف سیاسی تحریکوں نے جہدِ آزادی کو تیز سے تیز تر کر دیا۔ لیکن ان سیاسی تحریکوں کے علاوہ بھی متعدد پارٹیوں تنظیموں اور گروہوں نے جہدِ آزادی کو توانائی بخشنے کی کوششیں کیں جن میں کمیونسٹ پارٹی اور کمیونزم کے نظریے کے حامیوں کی مساعی بھی شامل ہے۔ کمیونسٹوں نے کمیونزم کے نظریے کی تبلیغ اور مزدوروں اور کسانوں کے استحصال کے خلاف آواز اٹھانے کے ساتھ ساتھ ملک کی آزادی کی ضرورت پر بھی زور دیا۔ اردو کے متعدد شعراء نے اپنی شاعری کے ذریعہ اس نقطہ نظر کو عام کرنے کی کوشش کی۔ بالخصوص ترقی پسند تحریک کے شروع ہونے کے بعد بہت سے شاعروں نے اس نقطہ نظر کی تشہیر

---

[1] "تلخیاں" ساحر لدھیانوی ص ۱۰۸-۱۰۹

بڑے ہی زور و شور سے کی اور حب الوطنی کے نغمے الاپ کر
وطن کی آزادی کا مطالبہ پرزور انداز میں کیا۔

یوں تو اکبر، اسمٰعیل، اقبال، جوش،
سرور، چکبست اور ظفر علی خاں نے وسیع تر پیمانوں پر ترقی
پسند تحریک کے لیے منظر کا کام کیا تھا لیکن اس کو پروان چڑھانے
میں بین الاقوامی فضاء میں سامراجیت اور فسطائیت سے
چھٹکارا پانے کی وہ تمنا تھی جو اشتراکی نظام کے روپ میں
نمودار ہوئی۔ دوسری طرف ہندوستان میں تیزی سے بدلتے
ہوئے سیاسی حالات عوام کو اس بات کا احساس دلا رہے تھے
کہ غلامی دراصل سیاسی محکومی ہے اور اس سیاسی محکومی کے
ساتھ اگر غیر ملکی حکومت ان کی دشمن ہے تو جاگیردارانہ نظام
اور نوکر شاہی بھی ان کی دشمن ہے۔ ہندوستانیوں کا وہ طبقہ جو
انگلستان میں زیر تعلیم تھا وہ اب بین الاقوامی تحریکوں سے
باقاعدہ طور پر روشناس ہونے لگا تھا اور ہندوستان کی قومی
تحریک میں بھی دھیرے دھیرے یہ احساس پیدا ہونے لگا تھا کہ
ہندوستانی عوام انگریزوں کی غلامی سے چھٹکارا پانے کے بعد بھی

ہندوستانی سرمایہ داروں سے نجات حاصل نہ کر سکیں گے۔ دوسری طرف ہٹلر اور مسولینی کا عروج، اسپین کی شکست، مشرق بعید میں عوامی طاقتوں کا ظہور یہی وہ واقعات تھے جنھوں نے ہندوستانی دانشوروں کے ہاتھوں ایک بہت بڑی ذمہ داری کی باگ ڈور دے دی۔

جواہر لال نہرو کی روس اور یورپ سے واپسی نے ایسے نوجوانوں کا ایک گروہ پیدا کر دیا تھا جو سوشلزم پر عقیدہ رکھتے تھے ان میں آچاریہ نریندر دیو، جے پرکاش نرائن رام منوہر لوہیا، ڈاکٹر احمد، ڈاکٹر اشرف، اروناآصف علی سبھاش چندر بوس اہم ہیں۔ ایک طرف تو یہ شخصیتیں ہندوستانی افکار کو متاثر کر رہی تھیں اور ان میں تفریق پسندانہ رجحان کو ختم کر کے اتحاد کا احساس بیدار کر رہی تھیں تو دوسری طرف ہندوستان میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے نفاذ اور مرکز میں دوعلی حکومت قائم ہونے والی تھی۔ اس سیاسی پس منظر میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام عمل میں آیا۔

ترقی پسند ادیبوں کی پہلی کانفرنس لکھنو میں

پریم چند کی صدارت میں ہوئی۔ پریم چند نے اپنے خطبہ میں کہا

"ہمیں حسن کا معیار بدلنا ہوگا ہماری کسوٹی
پر وہ ادب کھرا اترے گا جس میں تفکر ہو
آزادی کا جذبہ ہو، حسن کا جوہر ہو، تعمیر کی
روح ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو جو
ہم میں حرکت ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے
سلائے نہیں کیوں کہ اب زیادہ سونا موت
کی علامت ہوگی"۔

انھوں نے اپنے اس شہرہ آفاق خطبہ میں ادیبوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا

"اگر تمہیں اس غریب عورت میں حسن نظر
نہیں آتا جو بچے کو کھیت کی منڈیر پر سلائے
پسینہ بہا رہی ہے تو یہ تمہاری تنگ نظری کا
ثبوت ہے اس لیے کہ ان مرجھائے ہوئے ہونٹوں
اور کملائے ہوئے رخساروں کی آڑ میں ایثار
عقیدت اور متحمل پسندی ہے شباب سینے پر ہاتھ

دھر کر شعر پڑھنے اور صنف نازک کی
کج ادائیوں کے شکوے کرنے یا اس کی خود
پسندیوں اور چونچلوں پر سر دھننے کا نام
نہیں شباب نام ہے آئیڈیلزم کا، ہمت کا
مشکل پسندی کا، قربانی کا۔" [1]

یہ خطبہ ترقی پسند ادیبوں کی پہلی کانفرنس میں پڑھا گیا تھا اور ایک طرح سے ان تمام مقاصد کا احاطہ کرتا ہے جنھیں لے کر ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا ان ہی مقاصد و اقدار کو لے کر نوجوان ترقی پسند شعراء نے ادب کے میدان میں قدم رکھا۔ ان شاعروں میں فیضؔ، اختر الایمان، مجازؔ، علی سردار جعفری، کیفیؔ اور مخدومؔ کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس تحریک نے اردو شاعری کو ایک مثبت اور واضح نظام فکر اور نظریہ عطا کیا ایک ایسا نظریہ جس سے عوامی مسائل ہم آہنگ تھے جسے قبول کرنے کے بعد حب الوطنی کی ساری رکاوٹیں مثلاً علاقائی اور لسانی تعصب ختم ہو کر عوام اپنے اصلی دشمن یعنی سرمایہ داری اور سامراجیت کا

---

[1] "ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر" ترتیب پروفیسر قمر رئیس۔ عاشور کاظمی ص ۷۱م

مقابلہ کر سکتے تھے۔ وطن پرستی اور حب الوطنی کا بڑھتا ہوا رجحان کبھی کبھی جارحانہ شکل بھی اختیار کر رہا تھا۔ ترقی پسند تحریک نے اس تنگ دائرے سے نکل کر اس مقدس جذبے کی تطہیر اور تہذیب کر کے اسے آفاقیت کا شعور عطا کیا۔

فیض کی نظمیں "سوچ" رقیب سے، چند روز اور میری جان، کتے، سیاسی لیڈر کے نام، اے دل بیتاب ٹھہر، میرے ہمدم میرے دوست" سے ان کے سیاسی نظریات اور حب الوطنی کے جذبات پر روشنی پڑتی ہے۔ وہ ایک حساس فرد کی حیثیت سے معاشرے میں ظلم وستم اور استحصال کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

چند روز اور مری جان! فقط چند ہی روز
ظلم کی چھاؤں میں دم لینے پہ مجبور ہیں ہم
اور کچھ دیر ستم سہہ لیں، تڑپ لیں، رو لیں
اپنے اجداد کی میراث ہے معذور ہیں ہم
جسم پر قید ہے، جذبات پر زنجیریں ہیں
فکر محبوس ہے، گفتار پہ تعزیریں ہیں

اپنی ہمت ہے کہ ہم پھر بھی جیئے جاتے ہیں
زندگی کیا کسی مفلس کی قبا ہے جس میں
ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں
لیکن اب ظلم کی معیاد کے دن تھوڑے ہیں
اک ذرا صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں
عرصہ دہر کی تھلسی ہوئی ویرانی میں
ہم کو رہنا ہے پہ یونہی تو نہیں رہنا ہے
اجنبی ہاتھوں کا بے نام گرانبار ہے ستم
آج سہنا ہے ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے [1]

فیضؔ کو سیاسی محکومی کا شدید احساس تھا۔ قومی حکومت کے قیام کی تحریک جو دوسری جنگ عظیم کے دوران چل رہی تھی اس میں پوشیدہ خطرے سے فیضؔ نے اپنی نظم "سیاسی لیڈر کے نام" کے ذریعہ کانگریس کے اکابرین کو آگاہ کیا۔ فیضؔ نے پچاس سالہ تحریک آزادی کا حوالہ دیتے ہوئے کہا۔

سالہا سال میں بے آس اجڑے ہوئے ہات

---

[1] "نقش فریادی" فیض احمد فیض ص ۴۳

رات کے سخت و سیہ سینے میں پیوست رہے
جس طرح تنکا سمندر سے ہو سرگرم ستیز
جس طرح تیتری کہسار پہ یلغار کرے
اور اب رات کے سنگین و سیہ سینے میں
اتنے گھاؤ ہیں کہ جس سمت نظر جاتی ہے
جا بجا نور نے اک جال سا بن رکھا ہے
تجھ کو منظور نہیں غلبۂ ظلمت لیکن
تجھ کو منظور ہے یہ بات قلم ہو جائیں
اور مشرق کی کمیں گہ میں دھڑکتا ہوا دن
رات کی آہنی میت کے تلے دب جائے [1]

فیضؔ مظلوم عوام کو سرکشی اور بغاوت پر ابھارنا چاہتے ہیں اور ان میں عزم پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

بے فکرے دھن دولت والے
یہ آخر کیوں خوش رہتے ہیں
ان کا سکھ آپس میں بانٹیں

---

[1] "کلیات فیضؔ" فیض احمد فیض ص ۶۰

یہ بھی آخر ہم جیسے ہیں
ہم نے مانا جنگ کڑی ہے
سر کٹیں گے خون بہے گا
خون میں غم بھی بہہ جائیں گے
ہم نہ رہیں غم بھی نہ رہے گا [۱]
یہ مظلوم مخلوق گر سر اٹھائے
تو انسان سب سرکشی بھول جائے
یہ چاہیں تو دنیا کو اپنا بنا لیں
یہ آقاؤں کی ہڈیاں تک چبا لیں
کوئی ان کو احساس ذلت دلا دے
کوئی ان کی سوئی ہوئی دم ہلا دے [۲]

علی سردار جعفری کی شاعری کا عام موضوع پیغام بیداری اور دعوت انقلاب ہے۔

اٹھو ہند کے باغبانو اٹھو　　اٹھو انقلابی جوانو اٹھو

---

[۱] "کلیات فیضؔ" فیض احمد فیض ص ۳۶

[۲] "کلیات فیضؔ" فیض احمد فیض ص ۵۴

کسانو اٹھو کامگارو اٹھو　　نئی زندگی کے شرارو اٹھو

اٹھو کھیلتے اپنی زنجیر سے　　اٹھو خاک بنگال و کشمیر سے

اٹھو وادی و دشت و کہسار سے　　اٹھو سندھ و پنجاب و ملبار سے

اٹھو مالوے اور میوات سے　　مہاراشٹر اور گجرات سے

اودھ کے چمن سے چہکتے اٹھو　　گلوں کی طرح سے مہکتے اٹھو

اٹھو کھل گیا پرچم انقلاب　　نکلتا ہے جس طرح سے آفتاب

اٹھو جیسے دریا میں اٹھتی ہے موج　　اٹھو جیسے آندھی کی بڑھتی ہے فوج

اٹھو برق کی طرح ہنستے ہوئے　　کڑکتے، گرجتے، برستے ہوئے

غلامی کی زنجیر کو توڑ دو

زمانے کی رفتار کو موڑ دو [1]

جد و جہد آزادی کو سردار جعفری نے مختلف پہلوؤں سے سراہا ہے۔

"جنگ اور انقلاب" میں کہتے ہیں

انقلاب دہر کا بڑھتا ہوا پارا ہے جنگ

وقت کی رفتار کا مڑتا ہوا دھارا ہے جنگ

---

[1] "نئی دنیا کو سلام اور جھومر"　علی سردار جعفری　ص ۱۸۷

ہم سے آزادوں کا اس دم گیت گانا خوب ہے
سر پھرے باغی جوانوں کا ترانا خوب ہے [1]

انھوں نے اپنی طویل تمثیلی نظم "نئی دنیا کو سلام" میں آزادی کا مطالبہ اس طرح کیا

جنگ آزادی میں لڑنے والے سپاہی
اپنے دریا و دشت و جبل اپنا ملک و وطن مانگتے ہیں
یہ حسیں بوستاں ہے ہمارا
سارا ہندوستاں ہے ہمارا
ہم اس اپنے وطن اپنے گلزار میں اور کچھ بھی نہیں صرف
جینے کا حق مانگتے ہیں [2]

انھوں نے انگریزوں کے تسلط اور سامراج کی شدت سے مذمت کی۔ انگریزوں سے نفرت اور اپنے جذبہ آزادی کو اس طرح ظاہر کرتے ہیں۔

---

[1] "خون کی لکیر" علی سردار جعفری ص ۶۷
[2] "نئی دنیا کو سلام" علی سردار جعفری ص ۸۷

جانتے ہو ہماری نگاہوں میں تم کون ہو

عصرِ حاضر کے فرعون ہو

تم وہ قاتل ہو گردن پہ جن کی

اک دو کا نہیں بلکہ لاکھوں کروڑوں کا خون ہے

تم وہ پاپی ہو کہ پاپ بھی شرم سے سرنگوں ہے

ہم کو اپنی غلامی گوارا نہیں ہے

اک بھی ذرہ اس مکں میں اب تمہارا نہیں ہے

بھاگو بھاگو

اپنا جسم، اپنی جان اپنا من اپنا اخلاق و تہذیب و قانون

سب لے کے بھاگو

اس زمیں کے دہکتے ہوئے سینے سے سلطنت کی پرانی

بساط اب اٹھا لو

زندگی تم سے تنگ آ چکی ہے

ساری دنیا اب اکتا چکی ہے

موت کے بادبان کھول دو اور اپنے جہازوں کے لنگر اٹھاؤ

جاؤ جاؤ [1]

---

[1] "نئی دنیا کو سلام اور جمہور" علی سردار جعفری ص ۱۰۶-۱۰۸

کیفی اعظمی کی شاعری میں بھی اپنے دور کے سیاسی حالات اور جنگ آزادی پر نظمیں ملتی ہیں۔

نفاق و غفلت کی آڑ لے کر جیے گا مردہ نظام کب تک
رہیں گے ہندی اسیر کب تک رہے گا بھارت غلام کب تک
سہے گا بھارت ستم کہاں تک عوام اٹھائیں گے ناز کب تک
گلا دبائے گا آخریت کا تمہارا دست دراز کب تک
جانے ہم رحم کی درخواست کریں گے کب تک
ایک ایک نام پہ کہرام مچے گا کب تک
کب تک آئین کی محتاط مذمت ہوگی
کب تک اس طرح بالا قساط بغاوت ہوگی [1]

اس مایوسی کے باوجود انہیں یقین ہے کہ آزادی کا سویرا ضرور طلوع ہوگا۔ نظم "آندھی" میں انھوں نے اہل وطن کو یہ خوشخبری سنائی کہ غلامی کا دور اب ختم ہونے والا ہے

نشانات ستم تحریر ہے ہیں — حکومت کے علم تحریر ہے ہیں
غلامی کے قدم تحریر ہے ہیں — غلامی اب وطن سے جا رہی ہے

---

[1] "آخر شب" کیفی اعظمی ص ۶۱ - ۶۲

اٹھو دیکھو وہ آندھی آرہی ہے [۱]

نظم "آخری مرحلہ" میں انھوں نے ہندوستانیوں کو یہی مژدہ سنا کر نشان غلامی مٹا دینے کی تلقین کی۔

مٹا دو مل کے مٹا دو نشان غلامی کا
زمین چھوڑ چکا کاروان غلامی کا [۲]

اختر شیرانی بھی اپنے وطن کو دل و جان سے چاہتے تھے۔ ہندوستان سے اپنے پیار کا اظہار انھوں نے نظم "ہمارا وطن" میں یوں کیا ہے۔

نہ ہو کیوں ہمیں دل سے پیارا وطن یہ جنت کا ٹکڑا ہمارا وطن
سہانا ہے منظر ہے سارا وطن
ہمارا وطن! پیارا پیارا وطن
ہیں دریا رواں گیت گاتے ہوئے پرانی کہانی سناتے ہوئے
کہانی ہے سارے کا سارا وطن
ہمارا وطن! پیارا پیارا وطن
کسی سے ہمیں اتنی اُلفت نہیں ہے جتنی وطن سے محبت ہمیں

---

[۱] "جھنکار" کلیات اختر ص ۳۷
[۲] "آخر شب" کلیات اختر ص ۵۳

ہمیں جان و دل سے ہے پیارا وطن

ہمارا وطن! پیارا پیارا وطن [1]

ان کی حب الوطنی کا اظہار ان کی نظم "ساقی اٹھ تلوار اٹھا" میں بھی ہوتا ہے۔ اس نظم میں اگرچہ انھوں نے یونان کے ایک رند مگر محب وطن شاعر کا نقطہ نظر بیان کیا ہے لیکن اس سے ان کی حب الوطنی کے احساسات کی بھی وضاحت ہوتی ہے۔ نظم کے دو بند ملاحظہ ہوں۔

ہشیار کہ ہو جائے نہ کہیں پامال خزاں، گلزار وطن
گلہائے ارم سے بڑھ کے ہمیں محبوب ہے اک اک خار وطن
گہوارہ ماہ و انجم ہے رفعت کدہ کہسار وطن
پھر دل میں سرینہ ار اٹھا!
اٹھ ساقی اٹھ تلوار اٹھا!

مانا کہ کوئی ذرہ بھی یہاں آزاد غم ایام نہیں
تابع میں کسی کے صبح نہیں قبضے میں کسی کے شام نہیں
پر عشق وطن کے ماروں کا مرنے کے سوا کچھ کام نہیں

---

[1] "پھولوں کے گیت" (بچوں کے لیے نظمیں) اختر شیرانی ص ۱۳

آنکھیں ہوئیں کیوں خونبار اٹھا!
اللہ ساقی اللہ تلوار اٹھا![1]

ان کی حب الوطنی کی شاہکار نظم "اودیس سے آنے والے بتا" ہے جس سے ان کی وطن اور اہل وطن سے محبت کا اظہار ہوتا ہے۔ نظم کے چند بند ملاحظہ ہوں۔

اودیس سے آنے والے بتا
کس حال میں ہیں یاران وطن
آوارہ غربت کو بھی سنا
کس رنگ میں ہیں کنعان وطن
وہ باغ وطن، فردوس وطن
وہ سرو وطن، ریحان وطن
اودیس سے آنے والے بتا

اودیس سے آنے والے بتا
کیا اب بھی وہاں کے باغوں میں
مستانہ ہوائیں آتی ہیں؟

---

[1] "لالۂ طور" اختر شیرانی ص ۴۶ - ۴۷

کیا اب بھی وہاں کے پربت پر
گھنگھور گھٹائیں چھاتی ہیں؟
کیا اب بھی وہاں کی برکھائیں
ویسے ہی دلوں کو بھاتی ہیں؟
او دیس سے آنے والے بتا

او دیس سے آنے والے بتا
کیا اب بھی وطن میں ویسے ہی
سرمست نظارے ہوتے ہیں؟
کیا اب بھی سہانی راتوں میں
وہ چاند ستارے ہوتے ہیں؟
ہم کھیل جو کھیلا کرتے تھے، کیا
اب بھی وہ سارے ہوتے ہیں؟

او دیس سے آنے والے بتا
کیا اب بھی مکتی مندر سے
ناقوس کی آواز آتی ہے؟
کیا اب بھی مقدس مسجد پر

مسافر اذاں فقراتی ہے؟
اور شام کے رنگیں سایوں پر
عظمت کی جھلک چھا جاتی ہے؟

او دیس سے آنے والے بتا
کیا اب بھی کسی کے سینے میں
باقی ہے ہماری چاہ بتا؟
کیا یاد ہمیں بھی کرتا ہے اب
یاروں میں کوئی آہ بتا؟

للہ بتا، للہ بتا؟

او دیس سے آنے والے بتا
آخر میں یہ حسرت ہے کہ بتا
وہ عادت اہلیاں کیسی ہے؟
بچپن میں جو آفت ڈھاتی تھی
وہ آفت دوراں کیسی ہے؟
ہم دونوں تھے جس کے پروانے
وہ شمع شبستاں کیسی ہے؟ [1]

---

[1] "اپنی دھرتی اپنی رت" مرتب ابن الحسن ص ۱۲۱ تا ۱۲۸

ن۔م۔ راشد بھی ہندوستان کو غلامی کے قعرِ مذلت سے نکالنے کے لیئے بے تاب تھے۔ نظم "سپاہی" میں انھوں نے ایک سپاہی کی زبان سے اس خواہش کا اظہار کروایا کہ اس کی محبوبہ محبت کے زمزمے نہ چھیڑے اور اسے وطن کے غاصبوں سے ٹکرا کر جنگ آزادی میں کام آنے دے، ہندوستانیوں کو بدیسی سامراج سے برسرِ پیکار ہونے کے لیئے آمادہ کرنے کی کوشش کی۔

عمر گزری ہے غلامی میں مری
اس سے اب تک مری پرواز میں کوتاہی ہے!
زمزمے اپنی محبت کے نہ چھیڑ
اس سے اے جان پر و بال میں آتا ہے جمود
میں نہ جاؤں گا تو دشمن کو شکست
آسمانوں سے بھلا آئے گی؟
دیکھ خونخوار درندوں کے وہ غول
میرے محبوب وطن کو یہ نگل جائیں گے؟
ان سے ٹکرانے بھی دے
جنگ آزادی میں کام آنے بھی دے

تو میرے ساتھ مری جاں کہاں جائے گی؟ [1]

علی جواد زیدی نے بھی غلامان وطن کو فکری کی سلاخوں کو توڑ ڈالنے کے لیے پیام عمل دیا۔ نظم "منزلیں" میں انھوں نے ہندوستانیوں کو منزل آزادی کی راہ میں ثابت قدم رہنے کا سبق دیتے ہوئے فرمایا

تری منزل ہے آزادی کی منزل
تمناؤں کی آبادی کی منزل
تجھے ٹوٹے ہوئے دل جوڑنا ہیں
غلامی کی سلاخیں توڑنا ہیں
لگے بڑھنے وہ تاریکی کے سائے
بڑھے جانا قدم رکنے نہ پائے
فضا تاریک ہے مثل خلا دے
اندھیرے راستوں کو جگمگا دے
وطن تیرا مصیبت میں ہے ہمدم!
نجات اب تیری ہمت میں ہے ہمدم!

---

[1] "ماورا" ن۔م۔ راشد ص ۹۰

وطن ہی کیا زمانہ ہے اندھیرا
مگر ہونے ہی والا ہے سویرا
نئی تعمیر تیرے ہاتھ میں ہے
تری تقدیر تیرے ہاتھ میں ہے
بڑھے جانا، نہ ہرگز، ہچکچانا!!
مسافر! راستے میں رک نہ جانا [1]

مجاز نے اپنے ملک کی غلامی اور پستی کو بڑی تلخی سے بیان کیا ہے

اک سکوت ہر طرف ہو شربا و ہولناک
خلد وطن کے پاسباں خلد وطن کو کیا ہوا
کوئی بتائے عظمت خاک وطن کہاں ہے اب
کوئی بتائے غیرت اہل وطن کو کیا ہوا
کوہ و دمن وہی دشت وہی چمن وہی
پھر یہ مجاز جذبہ حب وطن کو کیا ہوا [2]

وہ اس ملکی اور پستی کو دور کرنا چاہتے ہیں

---

[1] "دیار سحر" علی جواد زیدی ص ۱۵۷-۱۵۸
[2] "آہنگ" مجاز ص ۱۵۲

کوئی دم میں اس گلستاں سے نکلنا ہے ہمیں
فرشِ گل سے دور انگاروں پہ چلنا ہے ہمیں
خارزارِ غم کو پیروں سے کچلنا ہے ہمیں
جادہ منزل میں گرنا ہے سنبھلنا ہے ہمیں
درس ایسا دے کہ دل آزردۂ منزل نہ ہو
فکر لاحاصل نہ ہو، اندیشۂ باطل نہ ہو [۱]

وہ اپنی شاعری کے ذریعہ عورتوں اور دوسرے طبقات کو بھی جہد آزادی کی ترغیب دیتے ہیں۔

سنانیں کھینچ لی ہیں سر پھرے باغی جوانوں نے
تو سامان جراحت اب اٹھا لیتی تو اچھا تھا
تیرے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا [۲]

ان کی نظم "آہنگ نو" کے چند شعر درج ہیں

---

[۱] "آہنگ" مجاز ص ۳۸-۳۹
[۲] "آہنگ" مجاز ص ۸۱

اے نوجوانانِ وطن روح جواں ہے تو اٹھو
آنکھ اس محشرِ نو کی نگراں ہے تو اٹھو
خوفِ بے حرمتی و فکرِ زیاں ہے تو اٹھو
پاسِ ناموسِ نگارانِ جہاں ہے تو اٹھو
اٹھو نقارہ افلاک بجا دو اٹھ کر
ایک سوئے ہوئے عالم کو جگا دو اٹھ کر

اپنی سرحد پہ جو اغیار چلے آتے ہیں
شعلہ افشاں و شرر بار چلے آتے ہیں
خوں بہاتے ہوئے سرشار چلے آتے ہیں
تم جو اٹھ جاؤ تو بے کار چلے آتے ہیں
خوں جو بہ نکلا ہے اس خوں میں بہا دو ان کو
ان کی کھودی ہوئی خندق میں گرا دو ان کو[1]

جاں نثار اختر نے اپنی شاعری کے ذریعہ اپنے جذبات و احساسات کو اپنے ہم وطنوں پر ظاہر کرنے کی کوشش کی اور انہیں غور و فکر پر مجبور کیا۔

---

[1] "آہنگ" مجاز ص ۱۱۴ - ۱۱۵

ہم اپنے ہم وطن کی آنکھوں کو کب تک یوں ہی پرنم رکھیں گے
کب مل کے بڑھیں گے میداں میں کب دوش پہ پرچم رکھیں گے
بکھرے ہوئے اس شیرازے کو کیا آج بھی برہم رکھیں گے

اے اہل وطن، اے اہل وطن

ظلمت میں غلامی کی آخر یوں گھٹ کے رہیں گے ہم کب تک
یہ ظلم کہاں تک جھیلیں گے یہ جبر سہیں گے ہم کب تک
ہونٹوں پہ لگی ہوں جب مہریں پر کچھ نہ کہیں گے ہم کب تک

اے اہل وطن، اے اہل وطن

وہ اپنے ہم وطنوں کے حوصلے اس طرح بڑھاتے ہیں۔

یہ دھوپ چکتی تنوں کی اک آن میں ڈھل سکتی ہے ابھی
زنجیر غلامی کی کیا ہے اک آہ میں گل سکتی ہے ابھی
ہم مل کے اٹھیں تو یہ دنیا اک پل میں بدل سکتی ہے ابھی

اے اہل وطن، اے اہل وطن

مرنے کے لیے جیتے ہیں تو کیا جینے کے لیے مرنا ہے ہمیں
اٹھو کہ بغاوت کا پرچم میداں میں علم کرنا ہے ہمیں
آزاد وطن کا پرچم بھی ہم شان سے لہرائیں گے کبھی [1]

---

[1] "تحریک آزادی میں اردو کا حصہ" معین الدین عقیل ص ۹۱م-۹۲م

مخدوم محی الدین نے ملک کی غلامی، پستی، بدحالی، غیر ملکی حکومت کے مظالم اور استبداد کے خلاف آواز بلند کی۔ وہ ایک ایسے جہان نو کی تمنا کرتے ہیں جس میں

نغمے شرر فشاں ہوں اٹھا آتشیں رباب
مضراب بے خودی سے بجا ساز انقلاب
معمار عہد نو ہو ترا دست پر شباب
باطل کی گردنوں پہ چمک ذوالفقار بن

ایسا جہان جس کا اچھوتا نظام ہو
ایسا جہان جس کا اخوت پیام ہو
ایسا جہان جس کی نئی صبح و شام ہو
ایسے جہان نو کا تو پروردگار بن [1]

وہ اس بات پر افسوس کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنی زندگی کو نذر آزادی زندان وطن کیوں نہ کیا۔

سالہا سال کی افسردہ و مجبور جوانی کی امنگ
طوق و زنجیر سے لپٹی ہوئی سو جاتی ہے

---

[1] "انتخاب کلام مخدوم محی الدین" انجمن ترقی اردو علیگڈھ ص ۳۳

کروٹیں لینے میں زنجیر کی جھنکار کا شور
خواب میں زیست کی شورش کا پتہ دیتا ہے
مجھ کو غم ہے کہ میرا گنج گرانمایۂ عمر
نذر زنداں ہوا
نذر آزادیٔ زنداں وطن کیوں نہ ہوا [1]

نظم "آزادیٔ وطن" میں انھوں نے اس بات کا اظہار کیا ہے کہ مشکل سے مشکل ترین حالات میں بھی وطن کی شمع آزادی گل نہیں ہو سکتی۔

لہو ہندوستاں کی جئے لہو ہندوستاں کی جئے
قسم ہے خون سے سینچے ہوئے رنگیں گلستاں کی
قسم ہے خون دہقاں کی، قسم خون شہیداں کی
یہ ممکن ہے کہ دنیا کے سمندر خشک ہو جائیں
یہ ممکن ہے کہ دنیا بستے بستے تھک کے سو جائیں
جلانا چھوڑ دیں دوزخ کے انگارے یہ ممکن ہے
روانی ترک کر دیں برق کے دھارے یہ ممکن ہے

---

[1] "انتخاب کلام مخدوم محی الدین"، انجمن ترقی اردو علیگڈھ ص ۳۸

زمین پاک اب ناپاکیوں کو دھو نہیں سکتی
وطن کی شمع آزادی کبھی گل ہو نہیں سکتی [1]

ایسی صورت حال میں مخدوم نے اپنے جذبہ و احساس کو بھی بیدار کرنے کی کوشش کی۔

کیا میں اس رزم کا خاموش تماشائی بنوں
کیا میں جنت کو جہنم کے حوالے کردوں
کیا مجاہد نہ بنوں
کیا میں تلوار اٹھاؤں نہ وطن کی خاطر [2]

وہ عوام کو جد وجہد آزادی کی ترغیب دیتے ہوئے کہتے ہیں

یہ جنگ ہے جنگ آزادی — آزادی کے پرچم کے تلے
ہم ہند کے رہنے والوں کی — محکوموں کی مجبوروں کی
آزادی کے متوالوں کی — دہقانوں کی مزدوروں کی
یہ جنگ ہے جنگ آزادی — آزادی کے پرچم کے تلے [3]

---

[1] "سرخ سویرا" مخدوم محی الدین ص ۵۵ - ۵۶
[2] "تحریک آزادی میں اردو کا حصہ" ڈاکٹر معین الدین عقیل ص ۹۷م
[3] "سرخ سویرا" مخدوم محی الدین ص ۱۰م

ساحرؔ نے بھی اپنی شاعری میں بغاوت اور آزادی کے جذبات کو بھرپور انداز میں پیش کیا ہے۔ شملہ کانفرنس کی ناکامی پر انھوں نے نظم "پھر وہی کنجِ قفس" لکھی۔ چند بند ملاحظہ ہوں۔

چند لمحوں کے لیے شور اٹھا ڈوب گیا
کہنہ زنجیرِ غلامی کی گرہ کٹ نہ سکی
پھر وہی سیلِ بلا ہے وہی دامِ امواج
ناخداؤں میں سفینے کی جگہ بٹ نہ سکی
ٹوٹتے دیکھ کے دیرینہ تعطل کا فسوں
نبضِ امیدِ وطن ابھری مگر ڈوب گئی
پیشواؤں کی نگاہوں میں تذبذب پا کر
ٹوٹتی رات کے سائے میں سحر ڈوب گئی
میرے محبوب وطن! تیرے مقدر کے خدا
دستِ اغیار میں قسمت کی عناں چھوڑ گئے
اپنی یک ظرفہ سیاست کے تقاضوں کے طفیل
ایک بار اور تجھے نوحہ کناں چھوڑ گئے
پھر وہی گوشۂ زنداں ہے وہی تاریکی

پھر وہی کہنہ سلاسل وہی خونیں جھنکار
پھر وہی بھوک سے انساں کی ستیزہ کاری
پھر وہی ماؤں کے نوحے وہی بچوں کی پکار
زندگی جبر کے سانچوں میں ڈھلے گی کب تک؟
ان فضاؤں میں ابھی موت پلے گی کب تک؟ [1]

حصول آزادی کی جد وجہد کے عزم کا اظہار وہ اس طرح کرتے ہیں

آج سے میرے فن کا مقصد زنجیریں پگھلانا ہے
آج سے میں شبنم کے بدلے انگارے برساؤں گا
ہم ٹھان چکے ہیں اب جی میں ہر ظالم سے ٹکرائیں گے
ہر منزل آزادی کی قسم ہر منزل پر دھرائیں گے [2]

اس دور میں کچھ ایسے بھی شاعر تھے جو بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے۔ جنھیں سیاست اور تحریک آزادی سے کوئی تعلق خاطر نہ تھا لیکن وہ بھی اپنی شاعری کے ذریعہ اپنے جذبات و احساسات کا بیان کرتے رہے۔ جگر مرادآبادی اس دور کے

---

[1] "نغمیاں" ساحر لدھیانوی ص ۱۴۳ - ۱۴۵

[2] "تحریک آزادی میں اردو کا حصہ" ڈاکٹر معین الدین عقیل ص ۸۹

منفرد غزل گو شاعر تھے سیاست سے ان کا کوئی تعلق کبھی نہ رہا۔
خود انھوں نے کہا

ان کا جو فرض ہے وہ اہل سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے [۱]

وہ فطرتاً رومان پرست شاعر تھے لیکن قوم اور وطن سے بھی انھیں محبت تھی چناں چہ اپنے تصورات میں انھوں نے ان موضوعات کو بھی جگہ دی جو انھیں اس دور کے سیاسی ماحول نے دیئے تھے۔

بھری بہار میں تاراجیٔ چمن مت پوچھ
خدا کرے نہ پھر آنکھوں سے وہ سماں گزرے
جنھیں کہ دیدۂ شاعر ہی دیکھ سکتا ہے
وہ انقلاب ترے سامنے کہاں گزرے [۲]

ناز جس خاک وطن پر تھا مجھے آہ جگرؔ
اسی جنت پہ جہنم کا گماں ہوتا ہے [۳]

---

[۱] "آتش گل" جگر مرادآبادی ص ۱۵۶
[۲] "آتش گل" جگر مرادآبادی ص ۹۷
[۳] "آتش گل" جگر مرادآبادی ص ۱۶۲

حب الوطنی میں وہ یہ بھی کہتے ہیں

یہ سنتا ہوں کہ پیاسی ہے بہت خاک وطن ساقی
خدا حافظ چلا میں باندھ کے سر سے کفن ساقی
سلامت تو ترا میخانہ تیری انجمن ساقی
مجھے کرنی ہے اب کچھ خدمت دار و رسن ساقی [۱]

اس دور کے دوسرے غزل گو شعراء میں مجروح اور جذبی بھی ہیں۔ مجروح کہتے ہیں

دیکھ زنداں سے پرے رنگ چمن جوش بہار
رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ [۲]

جذبی کے یہاں بھی کم و بیش یہی انداز ہے۔

ہم دہر کے اس ویرانے میں جو کچھ بھی نظارہ کرتے ہیں
انکو کی زباں میں کہتے ہیں آہوں میں اشارہ کرتے ہیں
کیا جانیے کب یہ پاپ کٹے کیا جانیے وہ دن کب آئے
جس دن کے لیے ہم اے جذبی کیا کچھ نہ گوارا کرتے ہیں [۳]

---

[۱] "آتش گل" جگر مراد آبادی ص ۱۳۸

[۲،۳] بحوالہ "اردو شاعری میں قومی یکجہتی کے عناصر" ڈاکٹر مجاور حسین رضوی ص ۳۹۸

فراق گورکھپوری بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ وہ انڈین نیشنل کانگریس کے رکن تھے اور تحریک ترک موالات میں شمولیت کے سبب قید بھی رہے۔ اپنے عہد کے انقلاب اور ملک کی جدوجہد آزادی کے تاثرات ان کی شاعری کا اہم حصہ ہیں۔

آزادی کی قدر و قیمت کو فراق نے اس طرح بیان کیا ہے۔

یہ مہر و ماہ، یہ تارے، یہ بام ہفت افلاک
بہت بلند ہے ان سے مقام آزادی
لہو ہے تیرے شہیدوں کا یا بکھرتے شرار
اچھل رہا ہے زمانے میں نام آزادی
فضا میں جلتے دلوں سے دھواں سا اٹھتا ہے
ارے یہ صبح غلامی یہ شام آزادی
قدم یہ اٹھتے ہیں بن ماندگان منزل کے
کہ رہبروں میں یہی ہیں امام آزادی [1]

آنند نرائن ملا بھی غزل گو شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں حب الوطنی اور انسان دوستی بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔

---

[1] "روح کائنات" فراق گورکھپوری ص ۱۵۸

غلاموں کی سنی ہی کیا بس اک آواز بے نغمہ
بہار باغ ہم رنگ بیاباں ہے جہاں میں ہوں
مجھے بھی شوق آزادی ہے لیکن کیا کروں اس کو
مرے چاروں طرف زنداں ہی زنداں ہے جہاں میں ہوں [1]

ستانے کو ستالے آج ظالم جتنا جی چاہے
مگر اتنا کہے دیتے ہیں فدائے وطن ہم ہیں [2]
فدائے ملک ہونا حاصل قسمت سمجھتے ہیں
وطن پر جان دینے کو ہی ہم جنت سمجھتے ہیں
کچھ ایسے آگئے ہیں تنگ ہم کنج اسیری سے
کہ اب اس سے تو بہتر گوشہ تربت سمجھتے ہیں
غلامی اور آزادی بس اتنا جانتے ہیں ہم
نہ ہم دوزخ سمجھتے ہیں نہ ہم جنت سمجھتے ہیں [3]

---

[1] "میری حدیث عمر گریزاں" آنند نرائن ملا ص ۸۰
[2] "میری حدیث عمر گریزاں" آنند نرائن ملا ص ۲۸
[3] "میری حدیث عمر گریزاں" آنند نرائن ملا ص ۲۹

۳ر جون ۱۹۴۷ء کو ماونٹ بیٹن نے تقسیم کا
اعلان کیا تو شمالی ہندوستان میں خون کی ہولی کھیلی گئی۔ کیوں
کہ اس سے قبل ہی کلکتہ، نواکھالی اور پنجاب میں خونیں فسادات
شروع ہو چکے تھے۔ اردو شاعروں نے اس دور میں بھی آخری
سانس تک محبان وطن کو متحد رکھنے کی کوشش کی۔
کیفی کی نظم "آخری مرحلہ" کا یہ بند ملاحظہ ہو

ابھی کھلیں گے نہ پرچم ابھی پڑے گا نہ دن
کہ منتظر ہے مگر متحد نہیں ہے وطن
پکارتا ہے افق سے لہو شہیدوں کا
کہ ایک ہاتھ سے کھلتی نہیں گلے کی رسن
پھر ایک بار بڑھو لے کے صلح کا پیغام
پھر ایک بار جلا دو شکوں کے خرمن
مٹا دو مل کے مٹا دو نشاں غلامی کا
زمین چھو رہا کاروان غلامی کا [1]

اردو شعراء نے ان فسادات پر بھی بے شمار نظمیں لکھیں اور

---

[1] "آخر شب" کیفی اعظمی ص ۵۳

اپنی وطن دوستی کا ثبوت دیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ پاکستان
کے مطالبہ یا مذہب کے نام پر وطن کی تقسیم کی مخالفت بھی کی۔

ہم کو بتلاؤ تو کیا مطلب ہے پاکستان کا
جس جگہ اس وقت ہیں مسلم نجس ہے کیا وہ جا؟
وہ ہمارے پیشوا جو فرد تھے ایمان میں
ان کے مدفن بن گئے کیا غیر پاکستان میں؟
بیش بہت سے ترے، چشتی کا سینہ چاک ہے
جلد بتلا کیا زمیں اجمیر کی ناپاک ہے؟
کفر کی وادی میں ایماں کا نگینہ کھو گیا
ہائے کیا خاک نجس میں شاہ مینا سو گیا؟
گلشن گردوں رہے جس سبز پھلواری کی دھاک
کیا نجس ہے اس کی خاک پاک تیرے منہ میں خاک
دین کا مخدوم جو کلیر کی آبادی میں ہے
آہ اس کا آستانہ کیا نجس وادی میں ہے؟
ہیں اماموں کے جو روضے لکھنؤ کی خاک پر
بن گئے کیا توبہ توبہ خطۂ ناپاک پر؟

بات یہ کیسی کہی تو نے کہ دل نے آہ کی
کیا زمیں طاہر نہیں درگاہ تو رانش کی ؟
واعظ اپنے منبر مسجد پہ جو گل بیز تھے
آہ کیا وہ دامن آلودہ تھے کفر آمیز تھے؟
آہ اس پاکیزہ گنگا کو نجس کہتا ہے تو
جس کے پانی سے کیا مسلم شہیدوں نے وضو
نام پاکستان نہ لے گر تجھ کو پاس دین ہے
یہ گزشتہ نسل مسلم کی بڑی توہین ہے
ٹکڑے ٹکڑے کر نہیں سکتے وطن کو اہل دل
کس طرح تاراج دیکھیں گے چمن کو اہل دل
گر وطن میں چھوٹی چھوٹی سی ریاست بن گئی
پھر تو یہ سمجھو کہ انگریزی حکومت بن گئی
کیا یہ مطلب ہے کہ ہم قرن آزادی رہیں
منقسم ہو کر عرب کی طرح فریادی رہیں
ٹکڑے ٹکڑے ہو کے مسلم خستہ دل ہو جائے گا
نخل جمعیت سراسر مضمحل ہو جائے گا [1]

---

[1] "اردو میں قومی شاعری کے سو سال" مرتبہ علی جواد زیدی ص ۳۶۷

"آخر کار ہندوستان نے آزادی حاصل کر لی
مگر بہت بڑی قیمت پر اور بڑے اذیت دہ
طریقے سے اس تقسیم کو منظور کرنا پڑا اور تقسیم
کے دوران خوف و ہراس اور قہر و غضب کے
طوفان میں سرحد کے دونوں طرف اپنے چھ لاکھ
بیٹوں اور بیٹیوں کو قتل ہوتے ہوئے اور
ایک کروڑ چالیس لاکھ کو گھر سے بے گھر ہوتے
ہوئے دیکھنا پڑا۔" [1]

تقسیم کا یہ کرب اردو ادب کے لیے بہت ہی روح فرسا تھا۔ اردو شعراء پر براہ راست اس کا اثر پڑا۔ جب تخریب کے شعلے تہذیب و شائستگی تو کیا خود خرمن ہستی کو جلا رہے ہوں تو نے نوازی اور فن کار کے فن میں ندرت کی گنجائش باقی نہیں رہ سکتی۔ چناں چہ اردو شاعروں نے غلامی کے بندھن ٹوٹنے پر جس جوش کا اظہار کیا اس میں والہانہ سرخوشی کے جذبات تو تھے لیکن اس سے زیادہ جن حالات میں آزادی ملی اور آزادی

---

[1] "ہندوستانی مسلمان آئینہ ایام میں" ڈاکٹر عابد حسین ص ۱۹۲

کے بعد ہمارے معاشرے پر جو کچھ گزری اس کے ردعمل کے طور پر اضمحلال، بے چینی، برہمی کے آثار نمایاں تھے۔

تقسیم کے بعد فسادات کے ہولناک نتائج سے ہمارے شاعر قدرتی طور پر بے انتہا متاثر ہوئے۔ اقبال سہیل، جوش ملیح آبادی، راہی معصوم رضا، سردار جعفری، وامق، ساحر اور دیگر شعراء باوجود مختلف نظریوں کے حامی ہونے کے ہم آواز نظر آتے ہیں۔

راہی معصوم رضا نے ایک نہایت خوبصورت نظم "اجنبی" میں ایک نو وارد کو مخاطب کر کے ہندوستان کی تاریخ بتائی ہے۔ اسی سلسلہ میں فسادات کا بھی نقشہ جن الفاظ میں پیش کیا ہے وہ قابل ستائش ہے۔

دوسری جنگ سے چودھری تھک گئے
اور جنتا کے تیور بھی کچھ اور تھے
راہ بر بھی بغاوت پہ راضی ہوئے
کالے بازار میں دام لگنے لگے
کچھ مشن آئے مشنِ محبت ہوئی

کچھ شکایت ہوئی کچھ بغاوت ہوئی

اور نتیجہ میں ہندوستاں بٹ گیا

یہ زمیں بٹ گئی آسماں بٹ گیا

شاخِ گل بٹ گئی آشیاں بٹ گیا

طرزِ تحریر طرزِ بیاں بٹ گیا

ہم نے سوچا کہ وہ خواب ہی اور تھا

اب جو دیکھا تو پنجاب ہی اور تھا

پانچ دریاؤں کا گیت بہنے لگا

اور کوہِ ہمالہ کا سر جھک گیا

عصمتِ زندگی پر کڑا وقت تھا

اور تمدن کھڑا چیختا ہی رہا

رام کے دیس میں کوئی سیتا نہ تھی

کرشن کے دیس میں کوئی رادھا نہ تھی

آلوؤں کی طرح سر کٹے ہیں یہاں

راستوں پر افق سے افق تک نشاں

کتنی دگڑی گئی ہیں یہاں ایڑیاں

یہ ہے ہندوستاں یعنی جنت نشاں

ایک گلزار نمایاں ہوا ہے یہاں

گھر جلا کر چراغاں ہوا ہے یہاں [1]

فسادات کی ابتدا نوا کھالی سے ہوئی تھی۔ وہاں سے انتقامی جذبہ سارے ہندوستان میں پھیل گیا۔ گاندھی جی غیر معمولی ہمت کا مظاہرا کرتے ہوئے خود وہاں پہنچ گئے تب فساد کی آگ ختم ہوئی۔ وامق نے اپنی نظم "ماں" میں مادر ہند کی زبان سے ان روح فرسا واقعات پر تبصرہ کیا ہے۔

کس نے ان آہنی دروازوں کے پٹ کھول دیئے
کس نے خونخوار درندوں کو یہاں چھوڑ دیا
کس نے آنچل پہ مرے ڈال دیئے انگارے
کس سے کٹنے بھی پایا نہ طوق گردن
ابھی تو صدیوں کا پامال تھا میرا خرمن
اس پہ ان وحشی لٹیروں نے سیہ کاروں نے
میرے ارمانوں کو تاراج کیا لوٹ لیا

---

[1] "اجنبی شہر اجنبی راستے" راہی معصوم رضا ص ۵، ۶

میرے معصوموں کو بے خانہ و برباد کیا
میری بہنوں سے ہوس خانوں کو آباد کیا
جل گیا میرا چمن لٹ گئی سب میری بہار
میرے بربط میں کوئی تار نہیں اب ثابت
میری چیخوں میں کوئی درد نہیں اب باقی [1]

واسق نے دہلی کے جاں سوز اور دردناک واقعات کو اس طرح نظم کیا ہے۔

یہ شہر دہلی بہشت نظر تھا جو کل تک
بنا ہوا ہے جہنم زمیں سے تا بہ فلک
سیاہ شعلے دلوں کی سیاہیاں لے کر
اٹھے ہیں آج وطن کی تباہیاں لے کر
درندے دوڑتے پھرتے ہیں سڑتی لاشوں میں
لہو سے تر کیئے ناخون و گوشت دانتوں میں
جو لٹ چکے ہیں وہ گھر سائیں سائیں کرتے ہیں
جو جل رہے ہیں ابھی سرد آہیں بھرتے ہیں

---

[1] "اردو ادب آزادی کے بعد" ڈاکٹر اعجاز حسین ص ۳۷

ہزاروں عورتوں کا آج لٹ رہا ہے سہاگ
نہ جانے کتنی تمناؤں میں لگی ہے آگ
یتیم بچے بلکتے ہیں گودیوں کے لیے
غریب شہر ترستے ہیں روٹیوں کے لیے
ہزار بار یہ بستی اجڑ اجڑ کے بسی
ہزار بار یہ دلّی بگڑ بگڑ کے بنی
مگر کچھ اب کی دفعہ اس طرح کے بپھرے ہیں
کہ جتنی چوٹیں ہیں اتنے ہی دل کے ٹکڑے ہیں
یہ جڑ تو سکتے ہیں لیکن کہاں ہیں وہ مرہم
جو ٹوٹے رشتوں کو قوموں کے کر دیں پھر باہم
مگر یہ کیسے ہو جب چارہ ساز خود لاچار
علاج کون کرے جب طبیب خود بیمار [1]

پنجاب کی تباہی کا منظر ملاحظہ ہو

اب یہ پنجاب نہیں اک حسیں خواب نہیں
اب یہ دوآب ہے نہ آب ہے نہ آب نہیں

---

[1] "اردو ادب آزادی کے بعد" ڈاکٹر اعجاز حسین ص ۵۰۷

اب یہاں وقت الگ صبح الگ شام الگ
ماہ و خورشید الگ، نجم فلک گام الگ
اسی تقسیم نے پنجاب تجھے لوٹ لیا
مرغزاروں کو ترے کھا گئی منحوس نظر
سوہنی اب نہ مہیوال کوئی گائے گا
اب یہاں ہیر کو رانجھا نہ کبھی پائے گا
کیوں کہ ان نغموں میں عرفاں کی جھلک آتی ہے
ایسے گیتوں سے اخوت کی مہک آتی ہے [1]

فسادات کی خونریزی پر یوں تو ہر شاعر نے افسوس کیا ہے لیکن جوشؔ نے جس تلخی سے اس بات کو پیش کیا ہے وہ اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ اس میں جوشؔ نے ناصح یا تماش بین کی حیثیت سے تبصرہ نہیں کیا ہے بلکہ وطن کی محبت میں ڈوب کر خلوص اور شعور کے ادراک کے ذریعہ اسے بیان کیا ہے۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ فساد برپا کرنے والے اپنے کو کتنا عظیم اور شجیع سمجھتے تھے۔

---

[1] "اردو ادب آزادی کے بعد" ڈاکٹر اعجاز حسین ص ۷۷

اے ناقد تباہی و بیاض روزگار
ہاں اس طرف بھی ایک نظر بہر کردگار
ہم ظلم کے ہیں شاہ شقاوت کے تاجدار
انسان ہے تو ڈال ہمارے گلوں میں ہار
ابلیسیت کا مرد ہے تو احترام کر
ہم ہیں امیر نادر و نیرو سلام کر

اے شخص ہم کو غور سے کیا دیکھتا ہے تو
ہاں ہم ہیں جو پیشہ و خوں ریز مرگ خو
یہ دیکھ کہنیوں سے ٹپکتا ہوا لہو
بیٹوں کے سر اڑائے ہیں باپوں کے روبرو
تو لیدہ کاملوں کی گھٹاؤں کے سامنے
بچوں کو بھون ڈالا ہے ماؤں کے سامنے

بوجہل کی شراب سے چھلکا کے جام کو
مٹا لگا دیا ہے محمدؐ کے نام کو
زندہ کیا ہے راون دوزخ مقام کو
ہاں ہم نے روسیاہ بنایا ہے رام کو

قرآں کو ہم پہ فخر ہے ویدوں کو ناز ہے
سچ ہے حرام زادے کی رسی دراز ہے [1]

اپنی دوسری نظم "ماتم آزادی" میں انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں اس فساد کو اس طرح نظم کیا ہے۔

اے ہم نشیں نہ ہندوستاں نہ پوچھ
روداد جام بخشی پیر مغاں نہ پوچھ
ہر لب سے کیوں بلند ہوئی ہے فغاں نہ پوچھ
کیوں باغ پر محیط ہے ابر خزاں نہ پوچھ
کیا کیا نہ گل کھلے روش فیض عام سے
کانٹے پڑے زبان میں پھولوں کے نام سے

سکوں کی انجمن میں خریدار آ گئے
سیٹوں کے خادمان وفادار آ گئے
کھدر پہن پہن کے مہ اطوار آ گئے
در پر سفید پوش سیہ کار آ گئے
دشمن گئے تو دوست بنے دشمن وطن
خلعت کی تہ کھلی تو برآمد ہوا کفن [2]

---

[1] "اردو ادب آزادی کے بعد" ڈاکٹر اعجاز حسین ص ۸۵
[2] "انتخاب کلیات جوشؔ"، مرتب ڈاکٹر فضل امام ص ۴۴

کود ہے نرگس وطن، نوراد ھر زفراد ھر
ایک تبسم فرنگ ہر دو افق ہو ترنگ
نعش بدوش و نالۂ رنگ شام ادھر سحر ادھر [1]

غلام ربانی تاباں اپنی نظم "انتقام" میں فسادات کا ذمہ دار انگریزوں کو ٹھہراتے ہیں۔

مگر کسے میں دوش دوں
میں کس سے انتقام لوں
تباہیوں کی گود میں پلے ہوئے کسان سے؟
کہ جنگ انقلاب کے سپاہی نوجوان سے؟
غریب و ناتوان سے؟
نہیں نہیں.....
یہ سب مرے عزیز ہیں
یہ سب مجھے عزیز ہیں
میں کس سے انتقام لوں
بتا کسے میں دوش دوں

---

[1] "آزادی کے بعد ہندوستان کا اردو ادب" ڈاکٹر محمد ذاکر ص ۱۱۱

چمن میں کس نے آگ دی ہے موسم بہار میں
اک اجنبی سفید ہاتھ ۔ آتشیں و شعلہ بار
فضائے تیرۂ وطن میں رقص کر رہا ہے آج [1]

نقیم کا درد صرف نظموں ہی میں نہیں ملتا بلکہ غزل کہنے والے شاعروں نے بھی اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ جگن ناتھ آزاد کے کچھ شعر ملاحظہ ہوں۔

نہ پوچھو جب بہار آئی تو دیوانوں پہ کیا گزری
ذرا دیکھو کہ اس موسم میں فرزانوں پہ کیا گزری
بہار آتے ہی ٹکرانے لگے کیوں ساغر و مینا
بتا اے پیر میخانہ یہ میخانوں پہ کیا گزری
کہو دیر و حرم والو یہ تم نے کیا فسوں پھونکا
خدا کے گھر پہ کیا بیتی صنم خانوں پہ کیا گزری
نہ پوچھ آزاد اپنوں اور بیگانوں کا افسانہ
ہوا تھا کیا یہ اپنوں کو یہ بیگانوں پہ کیا گزری [2]

---

[1] "اردو میں قومی شاعری کے سو سال" مرتبہ علی جواد زیدی ص ۴۰۰

[2] "اردو ادب آزادی کے بعد" ڈاکٹر اعجاز حسین ص ۶۸

جگر جیسے رومان پرست شاعر نے بھی اس دور کی تلخی کو شدت سے محسوس کیا۔ ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

فکرِ جمیل خواب پریشاں ہے آج کل
شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آج کل
انسانیت کہ جس سے عبارت ہے زندگی
انساں کے سائے سے بھی گریزاں ہے آج کل
دل کی جراحتوں سے کھلے ہیں چمن چمن
اور اس کا نام فصلِ بہاراں ہے آج کل
ہے زخمِ کائنات جو ہندو ہے ان دنوں
ہے داغِ زندگی جو مسلماں ہے آج کل [1]

لیکن یہ بات نہیں ہے کہ ہمارے اردو شعراء نے صرف آزادی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورت حال کا ماتم کیا ہے بلکہ انھوں نے آزادی کا پرجوش خیر مقدم کرتے ہوئے جشنِ آزادی بھی منایا ہے۔ اس سلسلے کی اہم نظمیں اقبال احمد سہیل کی "مبارک باد آزادی"، مجاز کی "بلا جشنِ آزادی" اور سکندر علی وجد کی "آفتاب ناز"

---

[1] "اردو ادب آزادی کے بعد" ڈاکٹر اعجاز حسین ص ۶۸

قابل ذکر ہیں۔ چند نظموں سے اقتباسات پیش ہیں۔

حکم معزولی بہ نام تیرگی آ ہی گیا
وادیِ شب میں پیامِ روشنی آ ہی گیا
اے عروسِ ہند کے بکھرے ہوئے موتی کے ہار
گوندھنے پھر تجھ کو تیرا جوہری آ ہی گیا
شمع رکھی جا رہی ہے ہند نو کے سامنے
نظمِ افرنگی کا نغمہ آخری آ ہی گیا
اک حقیقت بن کے ملا خوابِ ارمانِ وطن
اے زہے قسمت کہ اپنے جیتے جی آ ہی گیا [1]

اس سلسلے کی سب سے اچھی نظم اقبال احمد سہیل کی "مبارک باد آزادی" ہے۔

گلزارِ وطن کی کوئی دیکھے تو بہن آج
سرشار ہے خوشبو سے ہر اک دشت و چمن آج
غنچوں کا صبا توڑ گئی قفلِ دہن آج
ہے ہر گلِ خنداں کی زباں پر یہ سخن آج

---

[1] "اردو میں قومی شاعری کے سو سال" مرتبہ علی جواد زیدی ص ۳۹۰

صد شکر کہ لوٹا در زندان چمن آج

ارباب وطن تم کو مبارک ہو یہ محفل
ہاں جشن مناؤ کہ ہے موقع اسی قابل
ہو نامہ کہیں جوش طرب میں کہیں غافل
تخریب تو آسان تھی، تعمیر ہے مشکل
ہے سامنے منزل ابھی کل سے بھی کٹھن آج [1]

بالآخر آزادی کا یہ قافلہ مختلف مراحل طے کرتے ہوئے ۳۰ر جنوری ۱۹۴۸ء تک پہنچا۔ اور ۳۰ر جنوری ۱۹۴۸ء کی شام گاندھی جی ناتھو رام گوڈسے کی گولی کا نشانہ بن گئے۔ گاندھی جی کا قتل کوئی معمولی سانحہ نہ تھا یہ قتل اس فرقہ وارانہ ذہنیت کا سب سے زیادہ شرمناک مظاہرہ تھا جو بدیسی سامراج نے ہندوستان میں قائم کی تھی۔

اردو کے تقریباً ہر شاعر نے گاندھی جی کو خراج عقیدت پیش کیا۔ مجاز نے ان کے قتل کو نیکی اور بدی کی کشمکش قرار دیا اور انھیں تاریخ وطن کا لعل درخشاں رعرم سر

---

[1] "اردو میں قومی شاعری کے سو سال" مرتبہ علی جواد زیدی ص ۳۹۴

فروشی مرداں کہا ہے۔

اب سنگ وخشت و خاک وخزف سربلند ہیں
تاج وطن کا لعل درخشاں چلا گیا
دیو بدی سے معرکۂ سخت ہی سہی
یہ تو نہیں کہ زور جواناں چلا گیا
کیا اہل دل میں جذبۂ غیرت نہیں رہا
کیا بزم سرفروشی مرداں چلا گیا [1]

آنند نرائن ملا لکھتے ہیں

اس "پریم سندیسے" کو تیرے سینوں کی امانت بننا ہے
سینوں سے کدورت دھونے کو اک موج ندامت بننا ہے
اس موج کو بڑھتے بڑھتے پھر سیلاب محبت بننا ہے
اس سیل رواں کے دھارے کو اس ملک کی قسمت بننا ہے

جب تک نہ بہے گا یہ دھارا شاداب نہ ہوگا باغ ترا
اے خاک وطن دامن سے ترے دھلے گا نہیں یہ داغ ترا [2]

---

[1] "ہندوستاں ہمارا" مرتبہ جاں نثار اختر ص ۵۰۱

[2] "ہندوستاں ہمارا" مرتبہ جاں نثار اختر ص ۵۱۴

جد وجہد آزادی سے متعلق اردو شاعری کا یہ جائزہ دراصل ہندوستان کی سیاسی تاریخ اور ان داخلی اختلافات کا آئینہ ہے جس سے ملک دوچار تھا۔ اس دور میں شاعری نے ایک طرف فرقہ پرست عناصر سے ٹکر لی تو دوسری طرف تحریک آزادی کا ساتھ دے کر اپنی حب الوطنی کا ثبوت دیا۔ اس دور میں کئی دھارے نظر آتے ہیں۔ ایک طرف تو فرقہ پرستی کا سیلاب دوسری طرف طبقاتی شعور کی بیداری اور سیکولر انداز فکر اور پھر ایسے بھی رجحانات ملتے ہیں جو جارحانہ وطن پرستی کے علم بردار ہیں لیکن ان مختلف آوازوں میں اردو شاعری کی آواز منفرد اور یگانہ نظر آتی ہے۔

اردو شعراء نے ان قد آور شخصیتوں پر بھی نظمیں کہی ہیں جنھوں نے جنگ آزادی کے بالکل ابتدائی دور میں ملک میں غیر ملکی تسلط کی بنیادیں استوار نہ ہونے دینے اپنے ہم وطنوں کو برطانوی اقتدار کے شکنجوں سے محفوظ رکھنے اور ہندوستان کی آزادی کا تحفظ کرنے کے لیئے اپنی گراں قدر قربانیاں پیش کیں۔ حیدر علی اور ٹیپو سلطان کا شمار بھی مادر وطن کے ان بہادر سپوتوں میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنے ملک کو غلامی کے پنجہ سے بچانے کے لیئے بے مثال ہمت و جرات، شجاعت و بہادری کا مظاہرہ کرکے اپنی وطن دوستی کا ثبوت دیا۔

ساغر نظامی نے نظم "حیدر علی" کہی جس میں انھوں نے ان کی شجاعت و بہادری کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ آج پھر مادر وطن کو حیدر علی جیسے فرزندوں کی ضرورت ہے۔ جو اس کے مردہ پیکر میں جان ڈال سکیں۔

وہ سیلاب شجاعت اور طوفان جوانمردی
وہ جس سے لرزہ بر اندام تھی دنیائے افرنگی
وہ داعی وطن وہ عاشق آثار آزادی

وہ منادِ حریت وہ علم بردارِ آزادی
جوانی کا مرقع آئینہ روحِ شجاعت کا
وہ اک معیارِ سرتاپا کمالِ عزم و ہمت کا
ہوائے تند تھا طوفان برق و بار تھا حیدر
نشانِ قہر یزداں سلطنت ایجاد تھا حیدر
ترے مرنے نے کی اک مہر قرطاسِ غلامی پر
کہ تیری زندگی تھی ضربِ احساسِ غلامی پر
ترے اٹھتے ہی ماحول دکن پر چھا گئے غاصب
دکن پر چھا گئے ننگ وطن پر چھا گئے غاصب
نہ ہے وہ ساز ہندی اور نہ وہ آہنگ شاہی ہے
متاعِ زندگانی اک فقط اپنی غلامی ہے
الٰہی پیکرِ مردہ میں کر دے زندگی پیدا
ضرورت ہے کہ پھر ہو آج اک حیدر علی پیدا [1]

حیدر علی کی طرح ان کے فرزند ٹیپو سلطان بھی شجاعت و بہادری کا نمونہ تھے اور حریت پسندی و حب الوطنی جیسے اوصاف سے

---

[1] "بادۂ مشرق"، ساغر نظامی ص ۱۴۵-۱۴۷

مزین تھے۔ "ابو الفتح ٹیپو سلطان" نظم کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

مجاہد، اے مجاہد، اے مرے سلطان آزادی
کلید باب عظمت، وارث ایوان آزادی
ہزاروں شیر تیری روح میں بیدار رہتے تھے
جھپٹنے کے لیئے اغیار پر تیار رہتے تھے
ترا جلوہ نشاط آور نوائے شاخ بلبل تھا
ترا پائے حسین و پاک مسجود فرنگی تھا
بلند از قید رنگ و نسل دین و نیکی و شر تھا
محبت کا پیامی اور اخوت کا پیمبر تھا
ندیم زندگی لو پیامی شجاعت تھا
وہ غداروں میں تنہا اک شہید ملک و ملت تھا
جو اس کا نغمہ رنگیں کسی نے سن لیا ہوتا
تو اپنے ہاتھ ہوتے اور ساز ایشیا ہوتا
کہیں دنیا ہلا سکتی ہے ان کو بھی باطل سے
گرے ہیں سینۂ تاریخ میں خونی قلم تیرے
انھیں قائم کریں گے ہم کبھی اوج ہمالہ پر

ترا اجلال زندہ ہو کے چھا جائے گا دنیا پر
تری روح مقدس رہبر احرار ہے سلطاں
فضا بیدار ہے آتش فشاں تیار ہے سلطاں
وطن میں ایک عصر آتش پھر آنے والا ہے
زمانہ آتش و خوں میں بدل ہی جانے والا ہے
دلوں میں پھر جنون شوق کی ایک موج پیدا ہے
ترا ہر قطرۂ خوں اک سمندر بننے والا ہے [1]

شعراء نے ان تمام قابل فخر رہنماؤں کو خراج تحسین پیش کیا جو تحریک آزادی کو رواں دواں رکھنے کے لیئے سرگرم عمل تھے اور جد وجہد آزادی کو تیز سے تیز تر کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

حسرت موہانی نے آزادی وطن کے لیئے تلک کی گراں قدر خدمات کو خراج تحسین پیش کر کے اہل وطن کے دلوں میں حریت پسندی کے جذبات ابھارنے کی کوشش کی۔

اے تلک اے افتخار جذبہ حب وطن
حق شناس و حق پسند و حق بیں و حق سخن

---

[1] "بادہ مشرق" حصہ اول ساغر نظامی ص ۱۴۹-۱۵۰

تجھ سے قائم ہے بنا آزادی بے باک کی
تجھ سے روشن اہل اخلاص وفا کی انجمن
سب سے پہلے تو نے کی برداشت اے فرزند ہند
خدمت ہندوستاں میں کلفت قید محن
ذات تیری رہنمائے راہ آزادی ہوئی
تھے گرفتار غلامی ورنہ یاران وطن
تو نے خودداری کا پھونکا اے تلک ایسا فسوں
یک قلم جس سے خوشامد کی مٹی رسم کہن
ناز تیری پیروی پر حسرت آزاد کو
اے تجھے قائم رکھے تا دیر رب ذوالمنن [1]

تلوک چند محروم نے اعتدال پسند پارٹی کے قائد بال گنگا دھر تلک اور اعتدال پسند پارٹی کے گوپال کرشن گوکھلے دونوں کی حب الوطنی اور ایثار کی تعریف کی ہے۔ اپنی نظم "تلک اور گوکھلے" میں ان دونوں رہنمایان وطن سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے۔

خورشید اور قمر ہیں تلک اور گوکھلے

---

[1] "کلیات حسرت موہانی" حسرت موہانی ص ۱۲۲

عبادت میں جلوہ گر ہیں تلک اور گوکھلے
فرزندیوں تو مادرِ عبادت کے بے شمار
دو پارۂ جگر ہیں تلک اور گوکھلے
دونوں کی دھوم بیشۂ حب وطن میں ہے
واللہ شیر نر ہیں تلک اور گوکھلے
دونوں کی ایک منزلِ مقصود ہے مگر
دراصل ہم سفر ہیں تلک اور گوکھلے
مخدوم ایک گرم ہے اور ایک نرم ہے
خورشید اور قمر ہیں تلک اور گوکھلے [1]

مخدوم مہاتما گاندھی کے زبردست مداح تھے انھوں نے ان کو عبادت کی نجات کا پیمبر قرار دیتے ہوئے ان کی سلامتی کی دعا کی۔

انوارِ حیات کا ہے پیکر گاندھی — مثلِ خورشید جلوہ گستر گاندھی
عبادت میں رہے زندہ سلامت یارب — عبادت کی نجات کا ہے پیمبر گاندھی [2]

آئندہ نسل ملا مہاتما گاندھی کی بلند پایہ شخصیت کی مدح کرتے

---

[1] "کاروانِ وطن" تلوکچند محرومؔ ص ۵۲-۵۳
[2] "کاروانِ وطن" تلوکچند محرومؔ ص ۲۳۰

ہوئے کہتے ہیں

لذت تیری باتوں میں ہے صبائے وطن کی
ہونٹوں پہ ہنسی ہے گل رعنائے وطن کی
آنکھوں میں تجلی سی ہے فردائے وطن کی
تو ایک جھلک ہے رخ زیبائے وطن کی
ہستی پہ تری ناز ہو جتنا ہمیں کم ہے
اس ملک کی قسمت ترے ماتھے پہ رقم ہے [1]

ساغر نظامی نے مہاتما گاندھی کی مدح سرائی اس طرح کی ہے۔

تو نے مغرب پر محقق کر دیا حق وطن
باغباں سے کھل کر کہدی حدیث یاسمن
گامگار حریت اے شہریار حریت
اے رئیس حریت اے تاجدار حریت
ہندیوں کے جذبہ قومی کی اک صورت ہے تو
چلتا پھرتا پرچم رنگین حریت ہے تو
رکھ دیا قدرت نے کاندھے پر ترے بار وطن

---

[1] "جوئے شیر" آئینہ نرائن ملا ص ۶۵

کر لیا تسلیم تجھ کو سب نے سردار وطن
کس قدر آزاد ہے کتنا بہادر دل ہے تو
خود سروں میں سائی آزادی کامل ہے تو
محفل اغیار تیرے ذکر سے آباد ہے
بزم دشمن میں بھی تو آزاد سا آزاد ہے
وہ تاثر ہے ترے اک نعرہ آزاد میں
زلزلہ آیا ہوا ہے قصر استبداد میں
دیکھیے مشرق کو کیا ملتا ہے مغرب سے خراج
کوئی زنجیر غلامی یا کوئی کانٹوں کا تاج [1]

غیر ملکی تسلط سے ملک کو نجات دلانے کے لیئے جد وجہد آزادی میں مولانا ابو الکلام آزاد نے بھی اپنی گراں قدر قربانیاں پیش کیں۔ ساغر نظامی نے اس عظیم مجاہد کی خوبیوں کو اس طرح سراہا ہے۔

تکلم جس پہ صدقے ہے تبسم جس پہ قرباں ہے
ستاروں اور پھولوں کا تبسم جس پہ قرباں ہے

---

[1] "بادہ مشرق" حصہ اول ساغر نظامی ص ۴۶۹-۴۷۰

نزاکت جس کی فطرت ہے لطافت جس کی فطرت ہے
مقدس ہر نفس جس کا نسیم باغ جنت ہے
مفکر جس کی فکری قوتیں جان سیاست ہیں
مدبر جس کے محسوسات ایمان سیاست ہیں
وہ مشہود حقیقت اور آزادی کا شاہد ہے
مصور ہے، مقرر ہے، مدبر ہے، مجاہد ہے [1]

جواہر لال نہرو کا شمار مادر وطن کے ایسے ہی سپوتوں میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنے ہم وطنوں میں آزادی کی روح پھونکنے کی کوشش کی اور جہد آزادی میں ناقابل فراموش خدمات انجام دیں۔ سیماب اکبر آبادی نے نہرو کی قربانیوں کو سراہتے ہوئے فرمایا

تھک گیا راہ طلب میں چلتے چلتے کاروان
وقت بولا "ہے ابھی تحریک آزادی جوان"
شمع منزل تھی بقدر سوز پروانہ طلب
تھا ابھی دشت جنوں اور وہ دیوانہ طلب
کاروان وامانگی سے جب نظر آیا خموش

---

[1] "بادہ مشرق" حصہ اول سائنز لکھنؤ ۱۹۴۱ء ص

آگیا لبیک کہہ کر اک جوان سرفروش
روح آزادی جوانان وطن میں پھونک دی
آگ اس کے سوز نے صحن چمن میں پھونک دی [1]

آزادی کے پرستار حسرت موہانی نے بھی اپنے ہم وطنوں کے دلوں میں حریت پسندی کی شمعیں فروزاں کرنے کی کوشش کی۔ ان کی حب الوطنی اور جذبہ آزادی کو سراہتے ہوئے سیماب اکبر آبادی کہتے ہیں

اس کے سینے میں بھی ہے اک خونچکاں داغ وطن
وہ بھی ہے اک طوطی آشفتہ باغ وطن
جیل کی تنہائی میں نفس آزمائی اس نے کی
ہم غلاموں کے لیے سعی رہائی اس نے کی
دل کے ٹکڑے اس کے لب تک نالہ بن کر آئے ہیں
مدتوں چکی پر آزادی کے نغمے گائے ہیں
آنکھ میں آنسو ہیں، ہونٹوں پر حدیث راز ہے
اس کی ہر آواز گویا دور کی آواز ہے
ڈھونڈتا ہے دل کی خاکستر میں اک حاصل ہنوز

---

[1] "کاروان امروز"، سیماب اکبر آبادی ص ۳۰-۳۱

ہے اسیر حسرت "آزادی کامل" ہنوز [1]

لوک چند فرقوم نے حسرت کی مدح سرائی اس طرح کی ہے۔

اے عاشق آزادی اے حسرت موہانی
اے پیکر بربادی، ناکام تن آسانی
اعزاز ترا ثابت زنداں کے گہن سے ہے
تو آج ہے عبادت میں رشک مہ کنعانی
جاں باز وطن تجھ سا پیدا نہ ہوا ہوگا
جرأت پہ تری قرباں خود جذبہ قربانی [2]

ظفر علی خاں جلیانوالہ باغ کے ہیرو سیف الدین کچلو کے جذبہ آزادی کی ستائش کرتے ہوئے کہتے ہیں

وطن کا خون ناحق جب بہایا مارشل لا نے
تو سرخی اس لہو کی بن گئی عنوان امرتسر
پکڑ کے لے گئے زنداں میں سیف الدین کچلو کو
مرنگستان کی مٹی میں آئی جان امرتسر

---

[1] "کاروان امروز" سیماب اکبرآبادی ص ۲۹ - ۳۰

[2] "کاروان وطن" لوک چند فرقوم ص ۱۷۱

اسے اس کے خدا نے فطرت آزادی بخشی ہے

دو بالا ہو گئی جس کی بدولت شان امرتسر [1]

اردو شعراء نے عظیم المرتبت رہنمایان وطن اور شہیدان وطن کی موت پر مرثیے بھی کہے اور ان کی حب الوطنی کو بھی سراہا۔

یکم اگست ۱۹۲۰ء کو بال گنگا دھر تلک نے اس دار فانی سے کوچ کیا۔ ان کی وفات پر مختلف شعراء نے مرثیے کہے اور ان کی خدمات کو سراہا۔

چکبست لکھتے ہیں

اٹھ گیا دولت ناموس وطن کا وارث

قوم مرحوم کے اعزاز کہن کا وارث

جاں نثار ازلی شیر دکن کا وارث

پیشواؤں کے گرجتے ہوئے دن کا وارث

تھی سمائی ہوئی بے باکی بہادر آنکھوں میں

آخری دم تک رہا باقی نگہبان آنکھوں میں

نگہبان وطن دبدبہ عام ترا

---

[1] نگارستان، مولانا ظفر علی خان ص ۱۶۶

دیں پاؤں یہ معلوم کو پیغام ترا
دل رقیبوں کے لرزتے تھے یہ تھا کام ترا
نیند سے چونک پڑے سن جو لیا نام ترا
یاد کر کے تجھے مظلوم وطن روئیں گے
بندہ رسم و جفا چین سے اب سوئیں گے

لاش کو تیری سنواریں نہ رقیبان کہن
ہو جبیں کے لیئے صندل کی جگہ خاک وطن
تر ہوا ہے جو شہیدوں کے لہو سے دامن
دیں اسی کا تجھے پنجاب کے مظلوم کفن

شور ماتم نہ ہو جھنکار ہو زنجیروں کی
چاہیئے قوم کے بھیشم کو چتا تیروں کی[1]

حسرت موہانی جو تلک کے حامیوں میں تھے انھوں نے کہا
ماتم نہ ہو کیوں بھارت میں بپا دنیا سے سدھارے آج تلک
بلونت تلک، مہراج تلک، آزادوں کے سرتاج تلک
جب تک وہ رہے دنیا میں رہا ہم سب کے دلوں پر زوران کا

۱۔ "جیو وطن" چکبست لکھنوی ص ۱۱۰ تا ۱۱۲

اب رہ کے بہشت میں نزد خدا روحوں پہ کریں گے راج تلک
ہر ہندو کا مضبوط ہے جی گیتا کی یہ بات ہے دل پہ لکھی
آخر میں جو خود بھی کہا ہے یہی پھر آئیں مہراج تلک [1]

محروم نے اپنی ایک نظم "زندہ جاوید" میں شمع آزادی کے پروانے تلک سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا

جہاں میں سرفروشوں کی ہے باقی داستاں جب تک
قوی اس داستاں سے ہے دل اہل جہاں جب تک
غلامی اور آزادی میں جب تک جنگ جاری ہے
اور اس کے بعد آزادی کا لہرائے نشاں جب تک
دل احرار کو جب تک جفا ہے باعث نفرت
وفا باقی ہے جب تک اور وفا کا امتحاں جب تک
ہے جب تک مایہ فخر ملل آئین خود داری
بنے اقوام ہے دوں ہستی ذلت نشاں جب تک
دلوں میں جب تک ہے جذبہ حب وطن باقی
لہو میں اس سے ہو جاتی ہیں پیدا گرمیاں جب تک

---

[1] "کلیات حسرت موہانی" حسرت موہانی ص ۲۷۵

رہے گا دہر میں ذکر گرامی اے تلک تیرا
کہ مر سکتا نہیں ہے نام نامی اے تلک تیرا [1]

۱۶ر جون ۱۹۲۵ء کو نامور مجاہد آزادی چترنجن داس کے انتقال پر تلوک چند محرومؔ نے اپنے تاثرات "نوحہ سی آر داس" میں بیان کیے۔

عالم نہ پوچھیے دل حسرت اساس کا
پیکر ہے کلفت و غم و حرمان و یاس کا
وقف ہزار درد ہے پھر جان ناتواں
پھر دل کو سامنا ہے غم بے قیاس کا
لے کر رہے گا کشتی صبر و قرار کو
طوفاں اٹھا ہے آج وہ بیم و ہراس کا
ظالم کو لاگ جوہر مردانگی سے ہے
شکوہ ہے گردش فلک ناشناس کا
ڈوبا ہے آج کوکب امید حریت
ماتم بپا ہے ہند میں سی آر داس کا

---

[1] "کاروان وطن"، تلوک چند محرومؔ ص ۱۵۶

وہ فخرِ ہند نازشِ بنگال چل بسا

قوم و وطن کو چھوڑ کے بدحال چل بسا [1]

۲۹ دسمبر ۱۹۲۷ کو مسیح الملک[2] حکیم اجمل خاں کی وفات پر
دتاتریہ کیفی نے مرثیہ کہا جس میں ان کے اوصاف پر روشنی ڈالی۔

تجھ سے دلی کی نہیں ہند کی دلداری تھی
ہر رگ و پے میں ترے حب وطن ساری تھی
دوستداری تھی رواداری تھی غم خواری تھی
ہاں تعصب سے تری طبع بہت عاری تھی

جن میں ہوں جمع یہ کل وصف وہ کم انساں ہیں
یہی اوصاف حسن حب وطن کی جاں ہیں

تو ہمیشہ وطنیت پہ فدا رہتا تھا
غم وطن کا نہ کبھی تجھ سے جدا رہتا تھا
ساز دل نغمۂ الفت سے چھڑا رہتا تھا

---

[1] "کاروان وطن" تلوک چند محروم ص ۱۶۰

[2] حکیم اجمل خاں نے عدم تعاون کی تحریک سے متاثر ہو کر گورنمنٹ کا عطا کردہ خطاب "حاذق الملک" اور "قیصر ہند" کا تمغہ لوٹا دیا تو جمعیۃ العلماء نے انھیں مسیح الملک کا خطاب عطا کیا۔

ملک کا درد ترے دل میں بھرا رہتا تھا

جان اس دل پہ فدا ہو کے نہ کیوں کر رہتی
دل پر درد کی چوٹوں کو وہ کب تک سہتی[1]

۱۷ نومبر ۱۹۲۸ء کو عظیم مجاہد آزادی لالہ لاجپت رائے کی موت سائمن کمیشن کی مخالفت میں مظاہرہ کرنے والے جلوس کی قیادت کرنے کے دوران پولیس کی لاٹھیوں کی چوٹوں کی وجہ سے واقع ہوئی تھی۔ ان کی موت نے اہل ہند میں برطانوی حکومت کے خلاف نفرت کے جذبات کو اور بڑھایا۔ اردو کے متعدد شعراء نے ان کو خراج عقیدت پیش کیا۔

ظفر علی خاں نے اپنی نظم "لاجپت رائے کی یاد میں" میں اہل وطن کو درس دیا کہ وہ بھی لاجپت رائے کی طرح وطن کے لیے اپنی جانیں قربان کر دیں۔

مٹا کرتی ہیں جس عزت پہ قومیں
ہے اس عزت کا ساماں لاجپت رائے
وطن پر جان دو تم بھی اسی طرح

---

[1] "واردات" پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی ص 151

ہو اجس طرح قرباں لاجپت رائے
بڑی مشکل سے ملتا ہے یہ رتبہ
نہیں ہوتا ہے آسان لاجپت رائے
وہ محفل رو رہی ہے اس کو جس میں
رہا برسوں غزلخواں لاجپت رائے
ہمیں رہ رہ کے یاد آیا کرے گا
ترا ایک ایک احساں لاجپت رائے
ہمارا نام ہے آزادیٔ ہند
اور اس نام کا عنواں لاجپت رائے [1]

پنڈت دتاتریہ کیفی نے "مرثیہ لاجپت رائے میں" مادر وطن کے لیئے ان کی قربانیوں کا اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

جان دے دی ہے وطن پر یہ ہے ایثار کی شان
نہ ڈرا ضرب ستم سے یہ ہے احرار کی شان
آگے بڑھا کر نہ ہٹے ہے یہی سردار کی شان
جیسے علی سے بڑھی تھی رسن و دار کی شان

---

[1] "بہادستان" ظفر علی خان ص ۱۵۴

روح تازہ ہے وطن کو یہ تری قربانی
تھی اسے خون جگر سے ترے عزت پانی [1]

۱/ جنوری ۱۹۳۱ء کو مجاہد اعظم محمد علی جوہر نے اس دار فانی سے کوچ کیا۔ انھیں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے سیماب اکبر آبادی نے فرمایا

وہ مبارز دوش، درد قوم میں ڈوبا ہوا
وہ غلامی کے بھنور سے سخت گھبرایا ہوا
جذب گو اس کو کیا اشعر کیا نے بہت
اپنی جانب اس کو کھینچا رنگ دینا نے بہت
پھر بھی اس کی روح تھی خاص سے معمور تر
جان دے کر زندگی لیتی اسے منظور تھی
جینے والوں سے وہ بعد موت بھی ممتاز ہے
ساز میں ہر دل کے اس کی گرمی آواز ہے [2]

۶/ فروری ۱۹۳۱ء کو موتی لال نہرو کا انتقال ہوا۔ تلوک

---

[1] "واردات" بذیل ترجمہ دتاتریہ کیفی ص ۱۴۶

[2] "کارامروز" سیماب اکبر آبادی ص ۱۰۹

چند قلم نے اپنے غم و دکھ کا اظہار اس طرح کیا۔

آہ! اے نامدار موتی لال — نازش روزگار موتی لال
مالتی ہے ترا جہاں سارا — فخر شہر و دیار موتی لال
لال تھا بد نصیب بھارت کا — باعث افتخار موتی لال
حکم اس کا رواں دلوں پر تھا — گو نہ تھا تاجدار موتی لال
باغ جب وطن میں آیا تھا — بن کے باد بہار موتی لال
جوگ تو نے لیا وطن کے لیے — اے عداقت شعار موتی لال
زندگی تو نے اپنے ہاتھوں سے — کی وطن پر نثار موتی لال
چل دیا اور بد نصیبوں کو — کر گیا اشک بار موتی لال

رہبر اعظم وطن نہ رہا
آہ! وہ عالم وطن نہ رہا [1]

پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی نے موتی لال نہرو کی وفات پر اپنے درد و کرب کو اس طرح ظاہر کیا۔

سر پہ کھیلے جو وطن کے لیے سردار وہی
خادم قوم وہی زمرۂ احرار وہی

---

[1] "کاروان وطن" تلوک چند محروم ص ۲۳۲

جان و تن ملک پہ قربان ہو ایثار وہی
جس کی تقلید کرے خلق ہے کردار وہی

خادم قوم ہی مخدوم ہوا کرتے ہیں
قوم کی آن پہ جو جان فدا کرتے ہیں

ہند و یا تھا نہ کیا ہجر تلک کے غم میں
رحلت داس سے باقی نہ رہا دم دم میں
ماں تھا لاجپت اجل کے ابھی ماتم میں
ایک گاندھی کا علمدار رہا تھا ہم میں

وہ بھی افسوس کہ اب ہم سے جدا ہوتا ہے
آج سنگم بھی اسی غم میں لہو روتا ہے[1]

اردو شاعری نے ان شہیدان وطن پر بھی پھول نچھاور کیئے ہیں جنھوں نے ملک کو آزادی سے ہم کنار کرنے کے لیئے اپنی جان نذرانہ پیش کیا اور جام شہادت نوش کیا اور ان شہیدان وطن پر بھی اپنی عقیدت کے پھول نچھاور کیئے جن کے نام تاریخ کے صفحوں کی زینت تو نہ بن سکے لیکن جن کی قربانیوں نے ہندوستانیوں

---

[1] "واردات" پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی ص ۸۵

کے دلوں میں جذبہ حب الوطنی پیدا کر کے انھیں منزل آزادی کی طرف گامزن ہونے پر مجبور کیا۔

دسمبر ۱۹۲۷ء میں مشہور انقلابی اشفاق اللہ خاں اور ان کے تین ساتھیوں کو کاکوری میں ٹرین سے سرکاری خزانہ لوٹنے کے جرم میں پھانسی کی سزا دی گئی۔ ۱۹۳۵ء میں اشفاق اللہ خاں کے یوم شہادت پر منشی رام نرائن مشتاق لکھنوی نے ایک نظم شہید اشفاق اللہ کہی۔ نظم کے چند چند شعر ملاحظہ ہوں۔

ہر جیل میں ہے اک شور مچا اشفاق اللہ اشفاق اللہ
آتی ہے پھانسی گھر سے صدا اشفاق اللہ اشفاق اللہ
ہم آج یہاں یکجا ہو کر گردو دو اشک بہائیں گے
کچھ داد شہادت کی دیں گے کچھ ماتم اس کا منائیں گے
ہندو مسلم یکدل ہو کر اب ماتا کا کچھ کام کریں
کچھ ذکر شہید قوم کریں کچھ فکر رفاہ عام کریں [1]

۱۳ ستمبر ۱۹۲۹ء کو انقلاب پسند جتندر ناتھ داس بھی بھوک ہڑتال کی وجہ سے شہید ہو گئے۔ انھوں نے یہ بھوک ہڑتال

---

[1] "جدوجہد آزادی میں اردو شاعری کا حصہ" ڈاکٹر درخشاں تاجور ص ۳۹۴

جیل میں سیاسی قیدیوں پر ہونے والے وحشیانہ مظالم کے خلاف کی تھی۔ ظفر علی خاں اہل ہند کو اس عظیم قربانی کا احساس دلاتے ہوئے درس دیتے ہیں کہ وہ بھی اسی طرح ملک کی حرمت پر قربان ہو جائیں۔

بن نہیں سکتا صلاح الدین ایوبی اگر
ہند کی حرمت پہ مرمٹ اور جتندر داس ہو [1]

۲۳/مارچ ۱۹۳۱ء کو انگریزی حکومت نے عوام کی مخالفت کا خیال نہ کرتے ہوئے بھگت سنگھ راج گرو اور سکھدیو کو پھانسی دے دی۔ ان دلیروں کی شہادت سے پورے ملک میں انگریزوں کے خلاف نفرت اور غم و غصے کی لہر بہت شدید ہو گئی۔ ظفر علی خاں نے ان سرفروشان وطن کی قربانیوں کا احساس اہل ملک کو دلانے اور ان میں جذبہ حریت بڑھانے کے لیے نظم "نوشتہ تقدیر" میں لکھا

توانا ؤں کے بس میں ہے سراپائے حقارت سے
کروڑوں ناتوانوں کی تمناؤں کو ٹھکرانا

---

[1] "بہارستان" ظفر علی خاں ص ۵۶۴

دبا دینا سبی، مظلوم کی آہوں کو سینے میں
کسی بیکس کو ساری عمر آنسو خوں کے رلوانا
ہے جن کے دل میں آزادی کی دھن ان نوجوانوں کو
وطن کے عشق کی پاداش میں سولی پہ لٹکانا
بہا دینا کسی کی لاش کو ستلج کی موجوں میں
کسی کی لاش اُن کے پارساں اور خوں میں تڑپانا
ملوکیت پرستوں کے لیے یہ سب کچھ آساں ہے
مگر دشوار ہے قانون فطرت کا بدل جانا
زوال اس سلطنت کا ٹل نہیں سکتا ہے ٹالے سے
خود اپنی ہی رعایا سے پڑا ہے جس کو ٹکرانا
مکافات عمل سے گر وہ غافل ہیں تو بے شک ہوں
ہمارا کام تھا نیک اور بدگمان کو سمجھانا [1]

ایک اور انقلاب پسند ہری کشن کو بھی پھانسی کی سزا دی گئی اس انقلابی کو یہ سزا اس لیے دی گئی کہ اس نے لاہور میں ۱۹۳۲ء کے گانو کیشن میں یونیورسٹی ہال میں گورنر پنجاب کو ہلاک کرنے کی

---

[1] "بہارستان" ظفر علی خاں ص ۴۶۴

لو سنتی کی تھی۔[1] پھانسی کے بعد "میانوالی میں ایک صبح اس کی لاش کو بہت دور ویرانے میں لے جاکر سرکاری طور پر جلا دیا گیا اور ادھر جانے کی کسی کو اجازت نہ تھی۔"[2]

تلوک چند محرومؔ نے اس جاں نثار وطن کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے فرمایا

یہ نتیجہ سوز وطن کا ہے، یہ وطن کے درد کا ہے صلا!
کئی نوجواں اسے پائیں گے کئی نوجوانوں کو مل چکا!
انھیں پائمال نہ کر صبا، کہ ہری کشن کے یہ پھول ہیں
جو وطن کی آن پہ مر مٹا اسی بے وطن کے یہ پھول ہیں[3]

جوشؔ ملیح آبادی نے نظم "ایک شہید وطن کی یاد میں" میں ایک ایسے گمنام جاں نثار وطن کی خدمت میں خراج عقیدت پیش کیا جس نے جد وجہد آزادی میں جام شہادت نوش کیا۔

اے بہادر! اے شہید خنجر ارباب کیں
جان جو اس شان سے دیتا ہے مر سکتا نہیں

---

[1] "کاروان وطن" تلوک چند محروم ص ۱۹۶

[2] "کاروان وطن" تلوک چند محروم ص ۱۹۷

پڑ رہی ہے اس طرف گردن میں پھانسی کی گرہ
کھل رہی ہے اس طرف آغوش فردوس بریں [1]

تلوک چند محرومؔ نے ان تمام نامعلوم شہیدان وطن کو خراج عقیدت پیش کیا جنھوں نے وطن عزیز کو آزاد کرانے کے لیے اپنی جان قربان کر دی۔

جن سرافرازوں کی روحیں آج ہیں افلاک پر
موت خود حیران تھی جن کی جرأت بے باک پر
نقش جن کے نام ہیں اب تک دل غمناک پر
رحمت ایزد ہو دائم ان کی جان پاک پر
پھول برساؤ شہیدان وطن کی خاک پر!

پھول برساؤ کہ تھے ان میں کئی ایسے جواں
نوجوانی جن کی تھی رشک بہار بوستاں
ہو گیا گلزار ہستی جن کا پامال خزاں
دے گئے لیکن وطن کو وہ بہار جاوداں
پھول برساؤ شہیدان وطن کی خاک پر!

---

[1] "شعلہ و شبنم" جوش ملیح آبادی ص ۴۶

پھول برساؤ کہ ہے ان میں کئی کمسن ابھی
کھیلے جہاں میں کھیلنے ہنسنے کے ان کے دن ابھی
بے دیا کیساں تھے ان کے ظاہر و باطن ابھی
مر گئے بے نام پائندہ ہیں وہ لیکن ابھی
پھول برساؤ شہیدان وطن کی خاک پر!

چشم ظاہر بیں سمجھتی ہے کہ بس وہ مر گئے
درحقیقت موت کو فانی وہ ثابت کر گئے
جو وطن کے واسطے کٹوا کے اپنے سر گئے
خوں سے اپنے رنگ تصویر اجا میں بھر گئے
پھول برساؤ شہیدان وطن کی خاک پر![1]

اردو شعراء نے سرزمین ہند کے ان فرزندوں پر بھی نظمیں لکھیں جنہوں نے مادر وطن کے لیے اسیری کے مصائب برداشت کیے۔ مثال کے طور پر سیماب کی نظم "اے اسیران وطن" کے چند بند ملاحظہ ہوں۔

---

[1] "کاروان وطن"، تلوک چند محروم ص ۲۱۸-۲۲۰

سرزمینِ ہند کے فرزند کہلاتے ہو تم
حق فرزندی ادا کر کے کہاں پاتے ہو تم
جادۂ حب وطن میں ٹھوکریں کھاتے ہو تم
پا برہنہ اور ننگے سر چلے جاتے ہو تم
سایہ افگن ہو نہ سر پہ دامانِ وطن
اے اسیرانِ وطن!

ہیں مسرت آشنا خوگر دہ یاس قفس
موجۂ بادِ صبا ہے جوشِ انفاسِ قفس
اس کی آزادی بھی کیا جس کو نہ ہو پاسِ قفس
آشیاں بھی ہے قفس گر ہو نہ احساسِ قفس
ہے قفس آرائشِ صحنِ گلستانِ وطن
اے اسیرانِ وطن!

ہو جو تسکین آفریں تعبیر ایسی سوچ لو
جو سجا دے ذہن کو تقدیر ایسی سوچ لو
باعثِ تنظیم ہو زنجیر ایسی سوچ لو
کنجِ یکسوئی میں آؤ تدبیر ایسی سوچ لو

خود بخود آزاد ہو جائیں غلامانِ وطن

اے اسیرانِ وطن!

قید ہو کر مفتخر تم دیدۂ انساں میں ہو
شمع ہو فانوس میں صبا خم دوراں میں ہو
گو قفس میں ہو مگر اپنے بہارستاں میں ہو
کیوں پریشاں آدمی تنہائی زنداں میں ہو
یہ وطن ہی کی تو اک خلوت ہے زندانِ وطن

اے اسیرانِ وطن! [1]

---

[1] "ساز و آہنگ" سیماب اکبر آبادی ص ۷۵-۷۶

چھٹا باب

حُب الوطنی کے مختلف مظاہر۔ منتخب نظموں سے اقتباس

اردو کے ادیب و شاعر ابتدا ہی سے اپنی
سرزمین کو قابل تعظیم سمجھتے رہے۔ مادی و ذہنی وابستگی کی بنا
پر اس کی ترقی و فلاح میں کوشاں رہے اس کی تاریخ و تہذیب کو
بہت کچھ دیا اور خود بھی اس سے فیض یاب ہوئے آج تک یہ سلسلہ
جاری ہے۔ انھوں نے کبھی گنگا جمنا کی تقدیس و افادیت بیان
کی تو کبھی رام و نانک کے نغمات سرمدی سنائے کبھی دیوالی کے
دیپ جلائے تو کبھی جشن ہولی منایا اس طرح یہ چیزیں سینہ
بہ سینہ منتقل ہوتی رہیں اور وطن دوستی کا حق ادا کیا جاتا رہا۔
وجہی نے دکن کو دنیا کی انگوٹھی میں نگینہ اور ملک
کے سر کا تاج قرار دیا۔

دکن ملک بھوتیج خاصا ہے
تلنگانہ اس کا خلاصہ ہے

بحری نے وطن سے اپنی محبت کا اظہار یوں کیا

اب دل میں یہی ہے کہ وطن چھوڑ نہ جانا
جیوتی جو دکھن دکھن کے رتن چھوڑ نہ جانا

بھروں لو دکھن یوں ہے کہ جیوں نل کو دمن ہے
بس نل کو ہے لازم کہ دمن چھوڑ نہ جانا

ذوق کے بارے میں مشہور ہے کہ دکن کے بلاوے کو یہ کہہ کر رد کر دیا

آج کل گرچہ دکن میں ہے بڑی قدرِ سخن
کون جائے ذوق پر دلّی کی گلیاں چھوڑ کر

میر نے کہا

ہر اقلیم ہر گلی ہے کہیں دلّی سے بھی دیار ہوتے ہیں!

اسی طرح اکثر شاعر اپنی سرزمین سے چمٹے رہے لیکن جنھیں کسی مجبوری سے وطن چھوڑنا پڑا تو حسرتِ زدگی کا احساس فرو رہا۔ مثلاً میر نے اپنے وطن اصلی کو چھوڑتے ہوئے کہا

چلا اکبر آباد سے جس گھڑی
در و بام پر چشمِ حسرت پڑی
کہ تڑکا، نہ پہلے کیوں کر کروں
مگر ہر قدم دل کو بیکل کروں

نظیر کی یادِ وطن ملاحظہ ہو

یاد آتا ہمیں جب وطن اپنا تو اے نظیر
سرد حسرت سے پکار کہتے ہیں ہم ہائے اے نظیر

۱۰ واجسے زندہ دل شاعر کی حسرت و آرزو ملاحظہ ہو

بلبل کو کیا تڑپتے ہی دیکھا چمن سے دور
یارب نہ کیجیو تو کسی کو وطن سے دور

اس وقت وطن سے مراد اپنے اپنے شہر یا زیادہ سے زیادہ اپنے علاقے تھے جہاں کی ہر چیز سے عموماً دلی لگاؤ ہوتا ہے۔ اسی جذباتی تعلق کی بناء پر دیگر شاعروں کو بھی اپنے اپنے مقامات جنت نشان نظر آتے ہیں چنانچہ کلکتہ، گجرات، علی گڈھ، بمبئی، لاہور، حیدرآباد اور دلّی پر مختلف نظمیں ملتی ہیں جو اسی جذبۂ خالص یعنی حب الوطنی کے تحت لکھی گئی ہیں۔

کلکتہ پر غالب کے چند شعر ملاحظہ ہوں

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے
وہ میوہ ہائے تازہ و شیریں کہ واہ واہ
وہ بادہ ہائے ناب دگوارا کہ ہائے ہائے [1]

---

[1] "ہندوستان ہمارا" مرتبہ جاں نثار اختر ص ۲۸۲

سرزمین گجرات پر اختر شیرانی نے ایک نظم لکھی۔ چند بند ملاحظہ ہوں۔

اے سرزمین گجرات! اے خلد زار الفت
پھولوں میں تیرے رقصاں، روح بہار الفت
تیرا ہر ایک ذرہ ہے رازدار الفت
اے یادگار الفت، اے سرزمین گجرات
اے سرزمین گجرات، تو کان عاشقی ہے
پنجاب کے بدن میں تو جان عاشقی ہے
ہاں جان عاشقی ہے، ارمان عاشقی ہے
ایمان عاشقی ہے اے سرزمین گجرات [1]

"لکھنو" کے چند شعر ملاحظہ ہوں

عرش سامان کیوں نہ ہو خاک دیار لکھنو
ہے بہار خلد سے بڑھ کر بہار لکھنو
مشرقی رنگ تمدن کی ہے خالص یادگار
کیوں نہ ہو ہر مشرقی دل سے نثار لکھنو

---

[1] "ہندوستان ہمارا" مرتبہ جاں نثار اختر ص ۲۹۸

"اقبال" لاکھ لی تہذیب کا گہوارہ ہے
ہند میں کاہی ہے یہ تنہا وقار لکھنو
ماہ در آغوش ہے ہر ذرہ اس کی خاک کا
اے زہے حسن "طرب گاہ" دیار لکھنو
چونک کر خواب لحد سے اپنے ویرانوں کو دیکھ
جان عالم! آہ او جان بہار لکھنو
اگلی عظمت یاد آتی ہے یہ رونق دیکھ کر
ہم تو اختر اب بھی ہیں ماتم گسار لکھنو [1]

علی گڑھ پر مجاز کی نظم سے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

اس فرش سے ہم نے اڑ اڑ کر افلاک کے تارے توڑے ہیں
ناہید سے کی ہے سرگوشی، پروین سے رشتے جوڑے ہیں
اس بزم میں تیغیں کھینچی ہیں، اس بزم میں ساغر توڑے ہیں
اس بزم میں آنکھ بچھائی ہے، اس بزم میں دل تک جوڑے ہیں

ہر آہ ہے خود تاثیر یہاں ہر خواب ہے خود تعبیر یہاں
تدبیر کے پائے سنگیں پر جھک جاتی ہے تقدیر یہاں

---

[1] "ہندوستاں ہمارا" مرتبہ جاں نثار اختر ص ۲۹۸

دار، کالو سے لے کر موہن جھما آکاش یہاں
خود آنکھ سے ہم نے دیکھی ہے باطل کی شکست فاش یہاں [1]

[1] سردار جعفری کی نظم "بمبئی" ملاحظہ ہو

نہ جانے کیا کشش ہے بمبئی تیرے شبستانوں میں
کہ ہم شام اودھ، صبح بنارس چھوڑ آئے ہیں
پپیہے بولتے ہیں، کوکتی ہیں کوئلیں جن میں
ہمارے دل پہ ان گاتے ہوئے باغوں کے سائے ہیں
ترے زنداں کی تاریکی میں راتیں ہم نے کاٹی ہیں
تری سڑکوں پہ سوئے، تیری بارش میں نہائے ہیں
ادائے سرکشی دی ہے غرور سرفروشی کو
تری سفاکیوں نے کتنے خنجر آزمائے ہیں
مگر پھر بھی ہمارا عالم مہر و وفا یہ ہے
کہ تجھ کو لکھنؤ کی طرح سینے سے لگائے ہیں
مبارک ہم رکاب گردش شام و سحر ہونا
مبارک ہم سے آزادوں کا تجھ کو ہم سفر ہونا [2]

[1,2] "ہندوستاں ہمارا" مرتبہ جاں نثار اختر ص ۲۹۹-۳۵۱

حق یار خاں آزاد کی نظم "لاہور" کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

خطۂ لاہور منزل گاہ تہذیب و ادب
علم کے انوار سے روشن ہیں جس کے روز و شب
سینۂ پنجاب کا دل بلدۂ میرو سواد
جاں جس کی اہل دل کے واسطے الجم نژاد
جس کو بخشی ہے تمدن نے نرالی زندگی
جس کے بام و در پہ ہے تہذیب کی تابندگی
جس کی باد صبح میں پنہاں ہے تاثیر شراب
جس کے ذرّوں میں نہاں ہے بجلیوں کی آب و تاب
جس کا ہر ذرہ مرے جذبات کی تصویر ہے
جس کے ہر ذرہ پہ میرے نام کی تحریر ہے [1]

سکندر علی وجد کی نظم "حیدرآباد" ملاحظہ ہو۔

فضائے جاں فزا ذرہ ذرہ حسیں ہے
حقیقت میں ملک دکن گل زمیں ہے
ہر اک نقش تہذیب جو دل نشیں ہے

---

[1] "ہندوستاں ہمارا" مرتبہ جاں نثار اختر ص ۳۵۷

دل و دماغ و اداس اس کا امیں ہے

ا مہر و الفت کی جنت کہیں ہے

تو بے شک یہیں ہے یہیں ہے یہیں ہے

عروس وفا ہوش آیا ہے جب سے

ترا آستانہ ہے میری جبیں ہے

زمانہ دل آزار ہے بھی تو کیا غم

مجھے تری دلداریوں کا یقیں ہے

ترے لطف کا معجزہ ہے کہ میری

زباں گل فشاں ہے سخن آتشیں ہے

نفاست برستی ہے دیوار و در سے

تری خاک میں نکہت یاسمیں ہے

بہت خوشنما شہر دیکھے ہیں میں نے

مگر تیرا جادو کہیں بھی نہیں ہے [1]

نرسنگ کمار شاد کی نظم "دلی" کے چند بند پیش کیے جاتے ہیں۔

---

[1] "ہندوستان ہمارا" مرتبہ جاں نثار اختر ص ۳۰۲

پوچھا گیا جب اس سے وہ ہے شہر کون سا
جس کو نہ انقلاب زمانہ مٹا سکا
مٹ مٹ کے اور بھی جو ابھرتا چلا گیا
تاریخ روزگار نے ہنس کر دیا جواب
"دلّی جو ایک شہر ہے عالم میں انتخاب"
ماضی کی سرگزشت کا عنوان دل نشیں
صدیوں کی شان دار روایات کا امیں
لیکن کوئی علامت بوسیدگی نہیں
دم خم وہی، شکوہ وہی اور وہی شباب
"دلی جو ایک شہر ہے عالم میں انتخاب"
جو زرہ ہے یہاں کا وہ اک کوہ طور ہے
اک جلوہ گاہ اہل نگاہ و شعور ہے
مستقبل حیات کے چہرے کا نور ہے
والبتہ اس سے ہیں نئے ہندوستاں کے خواب
"دلّی جو ایک شہر ہے عالم میں انتخاب" [1]

---

[1] "ہندوستاں ہمارا" مرتبہ جاں نثار اختر ص ۳۰۹

ادب وطن سے محبت اور فطری وجذباتی تعلق

سے ہماری عام زندگی اور ادب میں شامل رہا ہے۔ وطن
کو ماں کا درجہ بھی دیا جاتا تھا اس لیئے یہاں کے ذرّے ذرّے
کو حب الوطنی قرار دی گئی۔ یہاں کے موسموں، تہواروں
میلوں پر مختلف نظموں میں محبت وعقیدت کا اظہار ملتا ہے۔
چند نظموں سے اقتباسات پیش کیئے جاتے ہیں۔

پھر اس انداز سے بہار آئی
کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی
دیکھو اے ساکنان خطۂ خاک
اس کو کہتے ہیں عالم آرائی
سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی
بن گیا روئے آب پر کائی
سبزہ و گل کو دیکھنے کے لیئے
چشم نرگس کو دی ہے بینائی
ہے ہوا میں شراب کی تاثیر
بادہ نوشی ہے باد پیمائی

(آمد بہار - غالبؔ)

ہیں اس ہوا میں کیا کیا برسات کی بہاریں
سبزوں کی لہلہاہٹ باغات کی بہاریں
بوندوں کی جھمجھاوٹ، قطرات کی بہاریں
ہر بات کے تماشے، ہر گھات کی بہاریں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

یہ رت وہ ہے کہ جس میں خرد و کبیر خوش ہیں
ادنیٰ، غریب، مفلس، شاہ و وزیر خوش ہیں
معشوق شاد و خرم، عاشق اسیر خوش ہیں
جتنے ہیں اب جہاں میں، سب اے نظیر خوش ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں [1]

. . . . . .

مہتاب ہے اب احباب ہو لی
اٹھو یارو بھرو رنگوں سے جھولی
ادھر یار اور ادھر خوبان صف آرا
تماشا ہے تماشا ہے تماشا

---

[1] "انتخاب نظیر اکبر آبادی"، تصحیح و ترتیب رشید حسن خاں ص ۵۴

مچی ہے دھوم و غل چاروں طرف ہے
اِدھر کو ہو لک اُدھر آواز دف ہے
گلال ابرک سے سب بھر بھر کے جھولی
پکارے یک بیک ہو لی ہے ہو لی
لگی پچکاریوں کی مار ہونے
ہر ایک سو رنگ کی بوچھاڑ ہونے [1]

(ہولی - شاہ حاتم)

ہر اک مکاں میں جلا پھر دیا دوالی کا
ہر اک طرف کو اجالا ہوا دوالی کا
سبھی کے دل میں سماں بھا گیا دوالی کا
کسی کے دل کو مزہ خوش لگا دوالی کا
عجب بہار کا ہے دن بنا دوالی کا

جہاں میں یار و عجب طرح کا ہے یہ تیوہار
کسی نے نقد لیا اور کوئی کرے ہے ادھار
کھلونے، کھیلوں، بتاشوں کا گرم ہے بازار

---

[1] ماخوذ از مثنوی بزم عشرت - شاہ حاتم

(۱) ۔۔۔ ماں میں چراغوں کی ہو رہی ہے بہار
سبھوں کو فکر ہے اب جا بہ جا دوالی کا [1]

(دوالی ۔ نظیر اکبر آبادی)

اختر شام کی آتی ہے فلک سے آواز
سجدہ کرتی ہے سحر جس کو وہ ہے آج کی رات
رہ یک گام ہے ہمت کے لیئے عرش بریں
کہہ رہی ہے یہ مسلمان سے معراج کی رات [2]

(علامہ اقبال)

ہے عابدوں کو طاعت و تجرید کی خوشی
اور زاہدوں کو زہد کی تمہید کی خوشی
رندِ عاشقوں کو ہے کئی امید کی خوشی
کچھ دلبروں کے وصل کی، کچھ دید کی خوشی
ایسی نہ شب برات نہ بقر عید کی خوشی
جیسی ہر ایک دل میں ہے اس عید کی خوشی

---

[1] "کلیاتِ نظیر اکبر آبادی" تصحیح و ترتیب رشید حسن خاں ص ۱۴۱

[2] "بانگ درا" علامہ اقبال ص ۲۴۹

پہلے پہر سے اللہ کے بنانے کی دھوم ہے
شیر و شکر سوّیاں پکانے کی دھوم ہے
پیر و جواں کو نعمتیں کھانے کی دھوم ہے
لڑکوں کو عیدگاہ کے جانے کی دھوم ہے
اسی نہ شب برات نہ بقر عید کی خوشی
جیسی ہر ایک دل میں ہے اس عید کی خوشی [1]

(عید الفطر - نظیر اکبر آبادی)

ہے یہ مجمع نکو سرشتی کا
ذکر کیا یاں گنہ کی زشتی کا
بحر ہے عارفوں کی کشتی کا
فخر ہے حرف سرنوشتی کا
رشک ہے گلشن بہشتی کا
عرس حضرت سلیم چشتی کا [2]

(حضرت سلیم چشتی کا عرس - نظیر اکبر آبادی)

---

[1] "انتخاب نظیر اکبر آبادی"، تصحیح و ترتیب رشید حسن خاں ص ۳۲
[2] "انتخاب نظیر اکبر آبادی" تصحیح و ترتیب رشید حسن خاں ص ۲۶

رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے
زور بلدیو جی کا میلا ہے

لوگ چاروں طرف سے آتے ہیں　　آکے عیش و طرب مناتے ہیں
دل سے سب درشنوں کو جاتے ہیں　　اپنے دل کی مراد پاتے ہیں
جھانجھ، مردنگ، دف بجاتے ہیں　　راس منڈل بھجن سناتے ہیں
دل میں پھولے نہیں سماتے ہیں　　سب یہ ہنس ہنس کے کہتے جاتے ہیں

رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے
زور بلدیو جی کا میلا ہے [1]

اردو شاعری میں ایسی سینکڑوں مثالیں موجود ہیں طوالت کے پیش نظر صرف چند مثالوں پر ہی اکتفا کیا گیا ہے۔

شاعری میں حب الوطنی کی داغ بیل یوں تو
چودھویں صدی عیسوی میں امیر خسرو کے ہاتھوں پڑ چکی تھی جس
کی تعمیر میں اٹھارویں اور انیسویں صدی کے شعراء نے بڑھ چڑھ
کر حصہ لیا۔ اس کا تابناک اور روشن پہلو اردو شعراء کی وہ
کوششیں ہیں جو مذہب کی وسیع النظری اور انسان دوستی اور
کثرت میں وحدت رنگا رنگی میں یک رنگی کے تصور کی ترویج کرتے
ہیں۔ اردو شاعری نے اپنے ملک ہندوستان کی طرح اس میں ہر
مکتبہ فکر اور ہر نقطۂ خیال کو جگہ دی اور اس تہذیبی رنگا رنگی
کی تصویر کشی کی جو ہندوستانی تہذیب اور ہندوستانی کلچر کا لازمی
جزو تھی۔ اس کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ ملک کی لسانی مذہبی تہذیب
اور اجتماعی طرز زندگی کے شعور کو زیادہ سے زیادہ تقویت بخشی
جائے۔ اردو شاعری کی انسان دوستی سیکولر روایات اور
متصوفانہ انداز فکر نے ایک ایسی کھلی فضا قائم کر دی کہ شاعر
نہ صرف ایک دوسرے کی تہذیب کا احترام کرتے ہیں بلکہ ان
مذاہب سے غیر معمولی عقیدت بھی رکھتے ہیں۔ مسلمانوں نے بڑی

تعداد میں کرشن جی، رام چندر جی، مہاویر جی، گوتم بدھ اور گرو نانک جیسے بزرگوں پر بے شمار نظمیں کہی ہیں اسی طرح ہندو شاعروں نے بھی حضرت محمدؐ، حضرت امام حسینؓ، خواجہ معین الدین چشتیؒ، حضرت نظام الدین اولیاءؒ اور امیر خسرو کو اپنی عقیدت کا منظوم نذرانہ پیش کیا ہے۔ یہ رسمی تخلیقات نہیں بلکہ جس جذبے خلوص اور عقیدت کی یہ نشاندہی کرتی ہیں ان میں روح اور دل کی گہرائیاں بسی ہوئی ہیں۔

روح انساں کو حقیقت سے ملانے والے
مرحبا! نغمۂ توحید سنانے والے

کردے بیدار ذرا پھر سے ضمیر انساں
خواب غفلت سے زمانے کو جگانے والے

کیوں نہ دم تیرا بھریں اہل ولا، اہل وفا
نقش الفت کا ہر اک دل میں بٹھانے والے

بخت درشن پہ بھی اک بار نظر ہو جائے
بگڑی تقدیر زمانے کی بنانے والے

(حضرت محمدؐ - درشن سنگھ دگل)

مبارک وہ زمیں جس میں ترا جسم آرمیدہ ہے
ترے مدفن سے ہے چشمہ رواں وحدت پرستی کا
ترے زرّوں کو چومے، صبح گردوں ہے تمنائی
سلام اے روح دانائی

(حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ - درشن سنگھ دگل)

مقام ان کا بھی اونچا ہے جو تیری راہ میں آئے
اور ان کی بات ہی کیا جو تیری درگاہ میں آئے
عبادت اور سجدوں کی بھی عزت دل میں ہے لیکن
عبادت وہ عبادت ہے مزا جب آہ میں آئے

(بزم خسروی - گوپی ناتھ امنؔ)

لبریز ہے شراب حقیقت سے جام ہند
سب فلسفی ہیں خطۂ مغرب کے رام ہند
ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز
اہل نظر سمجھتے ہیں اس کو امام ہند
تلوار کا دھنی تھا شجاعت میں فرد تھا
پاکیزگی میں، جوش محبت میں فرد تھا

(رام - اقبالؔ)

قوم نے سنا م گوتم کی ذرا پروا نہ کی
قدر پہچانی نہ اپنے گوہر یک دانہ کی
برہمن سرشار ہے اب تک مئے پندار میں
شمع گوتم جل رہی ہے محفل اغیار میں
بت کدہ پھر بعد مدت کے مگر روشن ہوا
نور ابراہیم سے آذر کا گھر روشن ہوا
پھر اٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے

ہند کو اک مرد کامل نے جگایا خواب سے

(نانک ۔ اقبال)

نہ تو ناقوس سے ہے اور نہ اصنام سے ہے
ہند کی گرمی ہنگامہ ترے نام سے ہے
میں ترے شیوۂ تسلیم پہ سر دھنتا ہوں
کہ ایک دور کی نسبت تجھے اسلام سے ہے
نقش تہذیب ہنود اب بھی نمایاں ہے اگر
تو وہ سیتا سے ہے لچھمن سے ہے اور رام سے ہے

(سری رام چندر ۔ ظفر علی خاں)

محسن کاکوروی نے جو قصیدہ "مدح خیر المرسلینؐ" حضرت محمدؐ کی شان میں کہا ہے اس کی تشبیب کی بنیاد ہندوؤں کے مقدس مقامات اور ان کے مذہبی رسومات کی بنیاد پر رکھ کر اس مخلوط مشترکہ تمدن کا اظہار کیا ہے جو اردو شاعری صدیوں سے اپنائی چلی آرہی ہے۔

سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل
برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا گنگا جل
گرمیِ اشنان کریں سرو قدان گل رو
جا کے جمنا پہ نہانا بھی ہے اک طول عمل
خبر اڑتی ہوئی آئی ہے مہابن سے ابھی
کہ چلے آتے ہیں تیرتھ کو ہوا پر بادل
دیکھیے ہوگا سری کرشن کا کیوں کر درشن
سینہ تنگ میں دل گوپیوں کا ہے بے کل
راکھیاں لے کے چلیں راکھی کی برہمن نکلیں
تار بارش کا تو ٹوٹے کوئی ساعت کوئی پل
ڈوبے جاتے ہیں تماشا میں بنارس والے

نوجوانوں کا سنیچر ہے یہ بڑھوا منگل
تہہ و بالا کیئے دیتے ہیں ہوا کے جھونکے
بیڑے بادوں کے نکلتے ہیں بڑے گنگا جل

(قصیدہ لغتیہ ۔ محسن کاکوروی)

اردو شاعری کے یہ وہ عناصر ہیں جنھوں نے مشترکہ تہذیب کو سنوارا اور وطن پرستی کے اس شعور کو تقویت پہنچائی جو صدیوں کے تاریخی تسلسل سے پیدا ہوا تھا۔ اس سلسلے کی ایک نظم مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی کی "آریوں کی آمد ہندوستان میں" ہے جس میں ہندوستان کی عظمت کے شعور کے ساتھ ساتھ ایک تہذیبی دور کے آغاز کی نشاندہی بھی ملتی ہے۔

وہ دیکھ کہ موجیں رقص کناں ہیں سطح زمیں پر گنگا کی
نو وارد آریا حیرت میں ہیں، دیکھ کے شان اس دریا کی
گنگوتری سے آتی ہے چلی، اٹھکھیلیاں کرتی دھار اس کی
آزادی ہے تیور سے عیاں، متوالی ہے رفتار اس کی
ہیں رنگ برنگ کے پھول کھلے زینت ہے چمن کی شباب ان کا
کھولا ہے نسیم سحر نے ابھی کس شان سے بند نقاب ان کا

آ رہے ہیں مسافر ہند میں جو، خیبر کے دروں سے اتر کے ابھی
دیکھے تھے انھوں نے لالہ و گل پامیری کی وادی میں نہ کبھی

اے آریو، آؤ قدم رکھو ان حسن بھرے گل زاروں میں
جنت کے مزے لوٹو گے سدا اس پاک زمیں کی بہاروں میں
تم گنگ و جمن کے کناروں پر شہر اپنے نئے آباد کرو
گا گا کے بھجن، کر کر کے ہون، ہو باؤ مگن دل شاد کرو [1]

یہ وسیع النظری، روشن خیالی اور انسان دوستی اس تہذیب کی مظہر تھی جس نے ہندوستان میں مختلف مذاہب کو ایک رشتہ میں منسلک کر رکھا تھا لیکن رنگا رنگی اور کثرت کے باوجود ان سب میں ایسی مشترک قدریں ہیں کہ سب الگ الگ ہوتے ہوئے بھی ایک ہیں گویا کثرت میں وحدت ہے اور ہندوستانی تہذیب حسین ترین تہذیبی پھولوں کا گلدستہ ہے۔ اس سلسلہ کا ایک بہت ہی دلکش پہلو ہے وہ یہ کہ وطن کو "ماں" کہہ کر مخاطب کیا گیا ہے۔ مادر وطن، مادر ہند، عبادت ماتا وغیرہ۔ یہ تصور کیوں پیدا ہوا؟ دراصل ماں کے ساتھ پرورش کرنے اور پالنے پوسنے کا تصور

---

[1] "ہندوستان ہمارا" جلد اول مرتبہ جاں نثار اختر ص ۱۵۸

والبہ ہے۔ وطن کی سوندھی مٹی بھی سب رہنے والوں کو پالتی پوستی ہے اسی لیئے وطن کو "ماں" کہا گیا ہے۔ وطن سے محبت گویا ماں سے محبت اور ماں سے محبت جیسے وطن سے محبت دونوں ہم معنی ہو گئے۔ ایسی بہت سی نظمیں ملتی ہیں جس میں وطن کو ماں کہہ کر مخاطب کیا گیا ہے۔

چند نظموں سے اقتباسات ملاحظہ ہوں

او ماتا او بھارت ماتا — تجھ پہ خدا کی رحمت ماتا
ندی کی لہریں دودھ کی دھاریں — گودی میں جنت کی بہاریں
کنگن اور چوڑی کی جھنا جھن — شاعر کے دل کی ہر دھڑکن
نام ترا جپتی ہے ماتا — تو کتنی پیاری ہے ماتا
ہندو مسلم سکھ عیسائی — تیری گود میں بھائی بھائی
چھینٹوں میں ترے بادل کے — سائے میں ترے آنچل کے
مسجد گرجا اور شوالہ — لنکا سے تا کوہ ہمالہ

. . . . . .

ماں تری تقدیر ہے کیسی — ہاتھوں میں زنجیر ہے کیسی
وہ تیموری تاج کہاں ہے — چندر بنسی راج کہاں ہے

کیا ہوئے ماں وہ تیرے بیالے　　تیڑھی ترچھی پگڑی والے
ماں وہ تیرے کوکھ کے بچے　　دھن کے پکے قول کے سچے
ہو گئے تیری لاج پہ قرباں　　تیرے مقدس تاج پہ قرباں
او ماتا گوتم کی ماتا　　ارجن اور بھیشم کی ماتا
شیو کی ماں اکبر کی ماں　　ستونتی ماں بلونتی ماں
دادو رسن کا کھیل سکھا دے　　نام پہ اپنے بھینٹ چڑھا دے
دیس کا ماہر سیوک ہو آنندھی　　ہر بچہ آزاد اور گاندھی
ہر دل میں اک طوفان کر دے　　شعلہ بھر دے بجلی بھر دے
جیون دے جیون کا پھل دے　　شکتی دے ہمت دے بل دے
زنجیریں ہیں بھاری ماتا　　پیاری ماتا، پیاری ماتا
بچے تجھ پر واری ماتا [1]

جمیل مظہری اپنی دھرتی سے، اپنی جنم بھومی سے، اپنے وطن سے ٹوٹ کر پیار کرتے ہیں۔ ان کی یہ نظم "بھارت ماتا" ان ہی جذبات و احساسات کی منہ بولتی تصویر ہے جس میں انھوں نے بھارت ماتا کے انیک روپ پیش کیے ہیں۔ وہ ماں ہے

---

[1] "نقش جمیل" جمیل مظہری　　ص ۹۷

خوبصورت ہے، مشفق ہے اپنی کوکھ میں چھپی ہوئی ساری دولت اپنے بیٹوں پر نچھاور کر دینے کے لیئے بیتاب ہے لیکن غلامی کی زنجیروں میں بندھی ہوئی ہے اور وقت کا سب سے بڑا تقاضا یہ ہے کہ ان زنجیروں کو توڑ دیا جائے اور اسے غلامی سے آزادی دلائی جائے۔

اس سلسلے کی ایک اور نظم آرزو لکھنوی نے "قومی گیت" کے عنوان سے لکھی ہے۔ اس میں وطن کو ماں کہہ کر سلام کیا ہے اور بھارت ماں کو پرنام کیا ہے۔

تو تو کیسی پیاری ماں ہے　　سب ماؤں سے اچھی ماں ہے
لاڈ اٹھانے والی ماں ہے　　اپنی ماں ہے، اپنی ماں ہے
ماتا کو پرنام، اے ماں اے ماں تجھ کو سلام

ہندو مسلم گورے کالے　　پریم کی دارو کے متوالے
سب ہیں تیری گود کے پالے　　سب ہیں بات پہ مرنے والے
ماتا کو پرنام، اے ماں اے ماں تجھ کو سلام [1]

---

[1] "اردو میں قومی شاعری کے سو سال" مرتبہ علی جواد زیدی ص ۲۵۳

اس طرح ہندوستان کو ماں کہنا، ماتا کہنا یا مادر وطن پکارنا جس کی روایت نادر کاکوروی سے شروع ہوئی تھی دوسرے شعراء نے بھی باقاعدہ طور پر اپنایا۔ وطن کو ماں کہنے میں حب الوطنی کے ساتھ ساتھ اس یکجہتی کا تصور بھی ہے جو رنگا رنگی سے یک رنگی پیدا کرتا ہے۔ ایک ماں کے کئی بیٹے ہوتے ہیں لیکن سب کا اپنا الگ وجود ہوتا ہے مگر ان سب کی ذات کا منبع و سرچشمہ ایک ہی ہوتا ہے۔

راقم نے حب الوطنی کے سلسلے میں وہ سارے گوشے منتخب کیے جو مختلف تصورات کی نمائندگی کرتے ہیں مثلاً مسلمان شعراء کا ہندو مذہبی بزرگوں کی شان میں نظمیں کہنا اور ہندو شعراء کا مسلمان مذہبی بزرگوں کو خراج عقیدت پیش کرنا قومی یکجہتی کے تصورات ابھارتا ہے۔ اسی طرح وہ لوگ جنھوں نے جہد آزادی میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا اور شہید ہوئے ان پر کہی گئی نظمیں اردو ادب میں جہد آزادی کے موضوع کے تحت آتی ہیں۔

لیکن جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے محبت کے

بے شمار رنگ ہیں اسی طرح حب الوطنی کے مظاہر بھی بہت سے ہیں۔ بے شک وطن سے محبت میں یہاں کے دریا، پہاڑ، کھیت، باغات وغیرہ شامل ہیں اور میلے تہوار وغیرہ سے وابستگی بھی حب وطن کا ایک رخ ہیں لیکن ان تحریکات سے ہمدردی بھی حب الوطنی کا ایک مظہر ہے جو تحریکات ملک کی آزادی کے لیئے پورے ملک کو متاثر کیئے ہوئے تھیں۔ اور وہ لوگ جنھوں نے شہادت کا راستہ اختیار کیا تھا انھیں خراج عقیدت پیش کرنا بھی اسی لیئے حب الوطنی کا ایک مظہر تھا کہ وہ شمع وطن کے

پروانے تھے۔ یہ سارے عناصر حب وطن کو ہر رخ سے ظاہر کرتے ہیں اسی لیئے انھیں شامل کیا گیا ہے۔ قومی یکجہتی اتفاق و اتحاد یا وسیع النظری اور رواداری بھی حب وطن ہی کے مظاہر تو ہیں۔ یہ رواداری بھی تو وطن ہی سے محبت کی بنا پر وجود میں آئی تھی کہ اگر ہمارا ہم وطن کوئی دوسرا عقیدہ رکھتا ہے اور کسی اور ڈھنگ سے عبادت کرتا ہے تو اس کا احترام کرنا چاہیئے اس لیئے کہ وہ ہمارا ہم وطن ہے۔ اسی بنا پر یہ سارے گوشے براہ راست یا بالواسطہ دونوں صورتوں میں حب الوطنی کے روشن اور تابندہ نقش ہیں۔

حرفِ آخر

ابتدائی صفحات میں قومیت اور حب الوطنی پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ جس کا ماحصل یہ ہے کہ اپنی قوم اور ملک کی بہتری و بہبودی کی خواہش کرنا حب الوطنی ہے۔ اردو شاعری نے جس کی بنیاد ہی مشترکہ کلچر پر ہے حب الوطنی کے سلسلے میں اپنے تشکیلی دور میں سب سے بڑا کارنامہ اس طرح انجام دیا کہ خود کو وسیلۂ اظہار بنا کر شمال اور جنوب کو ایک دوسرے سے روشناس کر کے علاقائیت کی سرحدیں توڑ دیں اور تہذیبی رنگا رنگی کی بنیاد پر ہندوستان کو ایک کر دیا۔ لیکن جب تک قوموں میں یکجہتی کا تصور نہ ہو حب الوطنی ممکن نہیں اس لیئے اردو شاعری جس کا وجود ہی قومی یکجہتی کی بنیاد پر ہوا تھا وہ اپنی روایت مزاج اور تہذیبی شعور کی بنیاد پر اس مشترکہ کلچر کی آبیاری کرتی رہی۔

اردو شاعری کے ابتدائی نمونے امیر خسرو اور دوسرے صوفیوں کے یہاں ملتے ہیں۔ پھر بعد میں دکنی شعراء نے ہندوستانی قصوں اور اخلاقی تصورات کو اپنی شاعری کا موضوع

بنایا۔ حب الوطنی کے جذبے نے شاعری میں رواداری باہمی احترام
اور انسان دوستی کو اور آگے بڑھاتے ہوئے ایسے پلیٹ فارم
تلاش کیئے جہاں مشترک تہذیب اور یکجہتی کے علمبردار عناصر کو
فروغ ہو سکے۔

اردو زبان کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ
اس زبان کے وجود کا سبب ہی آپسی یگانگت اور رواداری تھا
اور پھر جب صوفیائے کرام نے صلح، آشتی اور محبت کے اصولوں
کو پیش نظر رکھ کر سرزمین ہند میں اعلیٰ اخلاقی قدروں کو فروغ
دیا تو اس کام میں اردو ہی کو وسیلے کے طور پر استعمال کیا گیا۔
اس زبان کی تاریخ بہت زیادہ طویل نہیں لیکن اگر بغور مطالعہ
کیا جائے تو پچھلے پانچ سو برس کی تہذیبی اور سماجی تاریخ کی
جھلکیاں ایک زیریں لہر کی طرح اس کی تخلیقات میں نظر آتی ہیں۔
اس کے ساتھ ساتھ وہ سارے قدریں بھی اس زبان میں اپنی
جڑیں پیوست کیئے ہوئے ہیں جن کا تعلق ذہن انسانی سے ہے جیسے
مذہب، معاشرت، ثقافت اور وطنیت یا حب الوطنی۔
اردو شاعری میں حب الوطنی کی جامع اور مبسوط

اس لفظ سب سے پہلے محمد حسین آزاد کے یہاں ملتی ہے۔ حب الوطنی کے موضوع پر حالی نے بھی خامہ فرسائی کی ہے لیکن علی جواد زیدی کے مطابق حالی کے حب وطن کا تصور محدود ہے وہ وطن سے مراد صرف ایک جغرافیائی علاقہ رکھتے تھے لیکن آزاد نے حب وطن کی بڑی جاندار تشریح کی ہے۔

محمد حسین آزاد کے نزدیک حب وطن کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اگر کوئی اپنے وطن سے دور چلا جائے تو اس کی یاد میں تڑپتا رہے۔ جس طرح مچھلی کو پانی سے الگ کر دیا جائے تو وہ تڑپ تڑپ کر اپنی جان دے دیتی ہے اس طرح سے جان دینا حب الوطنی نہیں ہے بلکہ اس کے لیئے لازم ہے کہ ہر شخص کے لیئے خیر خواہی کا جذبہ ہو اور لطف و عنایات کا عمل رہے۔ انسان چاہے کسی حال میں ہو وطن میں ہو یا وطن سے دور ہو اس کو اپنے وطن اور وطن کے لوگوں سے محبت ہونا ضروری ہے۔ لیکن حالی کے نزدیک وطن سے صرف محبت ہی کافی نہیں ہے بلکہ انھوں نے قوم کو اہمیت دی ہے۔ ان کے خیال میں حقیقی حب الوطنی یہ ہے کہ انسان قوم کے مقابلے میں اپنی جان کو عزیز نہ جانے۔ انھوں

نے حب الوطنی میں مذہبی رواداری کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔ وہ شاید آنے والے دور کی آپسی منافرت کو محسوس کر رہے تھے اور اہل ہند کو اس کے مضر اثرات سے واقف کروانا چاہتے تھے۔ اس لیئے وہ آپسی اتفاق و اتحاد کو اہمیت دیتے ہیں اور ہندوستان کی غلامی کا سب سے اہم سبب آپسی نفاق کو قرار دیتے ہیں۔

اس طرح آزادؔ اور حالیؔ کی جلائی ہوئی حب الوطنی کی شمع نے تمام اہل ہند کے دلوں کو حب الوطنی کی روشنی سے منور کر دیا اور یہ جذبہ ایک اجتماعی جذبے کی طرح فروغ پاتا گیا۔

۱۸۵۷ء کے بعد ملک کی بربادی پر جتنے بھی شہر آشوب ملتے ہیں ان میں شعراء نے جہاں کہیں اپنے وطن میں موجود برائیوں اور خرابیوں کا ذکر کیا ہے یا ان پر نکتہ چینی کی ہے اس کا مقصد صرف یہی ہے کہ وہ اپنے ملک کی برائیوں سے سخت نالاں ہیں اور ان کی خواہش ہے کہ معاشرہ ان برائیوں سے پاک ہو۔ کئی شاعروں کو اپنے شہر سے ہجرت بھی کرنا پڑی لیکن ہجرت کے باوجود بھی ان کے ذہن کے کسی گوشہ میں اس مٹی کی

خوشبو فرور موجود رہی جس پر کہ وہ رہتے تھے۔ ان کے دل میں یہ خواہش پنہاں تھی کہ وہ اپنے وطن کو واپس لوٹیں۔ یاد ماضی (NOSTELGIA) انھیں اس دور میں لے جاتی ہے جب وہ اپنے وطن میں رہتے بستے تھے۔ انھیں اپنے ملک کی عظمت و شوکت جو، اب قصہ پارینہ بن چکی ہے یاد آتی ہے اور وہ بے قرار ہو اٹھتے ہیں۔ یہی سب کچھ اردو شعراء نے شہر آشوبوں میں پیش کیا ہے۔

۱۸۵۷ء میں رونما ہونے والی بغاوت کو تو انگریزوں نے کچل دیا لیکن وہ ہندوستانی عوام کے جذبہ حب الوطنی کے جوش کو کچلنے میں ناکام رہے۔ اہل ہند کے دلوں میں انگریزوں سے نفرت پروان چڑھتی رہی اور اس کے ساتھ ساتھ جابرانہ تسلط سے نجات حاصل کرنے کا جذبہ بھی شدت اختیار کرتا گیا۔ بیسویں صدی کے آغاز سے ہی مختلف تحریکوں نے جن میں سودیشی تحریک، ہوم رول تحریک، خلافت تحریک وغیرہ اہل ہند میں جذبہ حب الوطنی کو تیز سے تیز تر کرنے میں معاون ثابت ہوئیں۔ اس کے ساتھ ہی منٹو مارلے رفارم، کانپور کی مسجد

چاندنی بازار کے سانحہ، رولٹ ایکٹ اور جلیانوالہ باغ کے قتل عام نے ہندوستانیوں کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف نفرت کے جذبات کو بھڑکا کر ان میں سیاسی شعور کو بیدار کر کے حب الوطنی کے جذبہ کو پروان چڑھایا۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ملک کو غلامی سے نجات دلانے کے لیئے اس ملک کی زبان اور ادب کا بہت بڑا حصہ ہوتا ہے اسی طرح ہندوستان میں بھی جب حصول آزادی کے لیئے جد و جہد جاری تھی اس وقت اردو ہی مشترکہ تہذیب کی علمبردار تھی اور ملک کے کونے کونے میں بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ اس لیئے اردو شعراء پر یہ ذمہ داری تھی کہ وہ اپنی شاعری کے ذریعہ ملک میں انگریزوں کے خلاف فضاء ہموار کریں۔ اردو شاعروں نے یہ ذمہ داری پوری طرح نبھائی۔ انھوں نے اپنے قلم سے تلوار کا کام لیا۔

انگریز جب پہلی بار ملک میں بغاوت کی غرض سے داخل ہوئے اسی وقت سے اردو شاعروں نے صدائے احتجاج بلند کرنا شروع کیا۔ مصحفی، جرأت، ناسخ، آتش، مومن

وغیرہ نے اپنی شاعری میں کبھی واضح طور پر اور کبھی اشاروں کنایوں میں ہندوستانیوں کو انگریزوں کے بڑھتے ہوئے خطرے کا احساس دلانے اور ان کے دلوں میں انگریزوں سے نفرت کے جذبات کو بھڑکانے کی کوشش کی تھی۔ اور پھر ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں اردو شعراء نے اپنی حب الوطنی کا ثبوت اپنے قلم سے تو دیا ہی لیکن ساتھ ساتھ وہ اس بغاوت میں عملی طور پر بھی شریک ہوئے۔ نتیجہ میں انگریزوں نے ان شعراء کو اپنے انتقام کا نشانہ بنایا۔ اس بغاوت میں جن جن شعراء نے حصہ لیا وہ سب انگریزوں کے عتاب کا نشانہ بنے۔ ان میں بہادر شاہ ظفر، مفتی صدرالدین آزردہ، امام بخش صہبائی اور میر شکوہ آبادی قابل ذکر ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کی ناکامی کے بعد انگریز ہندوستان پر پوری طرح مسلط ہو گئے اور انھوں نے پورے ملک میں جبر و تشدد ظلم و استبداد اور تباہی و بربادی کا بازار گرم کر دیا۔ انگریزوں کے ظالمانہ رویہ سے ہندوستانیوں کے حوصلے پست ہو گئے لیکن اردو شعراء نے رفتہ رفتہ ان میں سیاسی شعور بیدار کرنے کا

فریضہ انجام دیا۔ اور بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی تقسیم بنگال کی مخالفت، برٹش مصنوعات کے مقاطعے اور سودیشی تحریک کی شروعات سے ہندوستان کی سیاسی زندگی نے ایک نئی کروٹ لی اور ہندوستانیوں میں اپنے حقوق کے لیئے لڑنے کا جذبہ بیدار ہوا۔ اس کے بعد مسلسل ملک میں ایسے واقعات رونما ہوتے گیئے جنھوں نے ہندوستانیوں کے دلوں میں برطانوی اقتدار سے نفرت کی لہر دوڑادی اور بے شمار ایسی تحریکات وجود میں آئیں جس سے ہندوستانیوں میں انگریز دشمنی کے رجحان کو تقویت ملی۔ اردو شعراء نے جد و جہد آزادی کے دوران پیش آنے والے ہر اہم واقعہ کو نظم کا جامہ پہنا کر اس کی تشہیر کی اور اسے عوام تک پہنچا کر ان میں ذہنی انقلاب پیدا کیا۔ انھوں نے ہر اہم تحریک پر پر جوش نظمیں کہہ کر اہل ملک کو اس کی اہمیت اور افادیت سے روشناس کرایا اور انھیں اس میں شریک ہو کر اسے کامیاب بنانے کی ترغیب دی۔

غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی قوم کو
ان زنجیروں کو توڑنے کے لیئے ذہنی طور پر آمادہ کرنے میں

ملک کی مختلف تنظیموں نے حصہ لیا تھا۔ اردو شعراء نے ان مختلف تنظیموں اور گروہوں کو سراہنے کے لیئے بھی نظمیں کہیں۔

اردو شعراء نے اپنے ہم وطنوں کو رہنمایان قوم اور شہیدان وطن کی گراں قدر قربانیوں سے بھی باخبر کرایا۔ اردو میں جہاں بے شمار ایسی نظمیں تخلیق ہوئیں جن میں رہنمایان وطن سے عقیدت کا اظہار کر کے محکوم ہندوستانیوں کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی ترغیب دینے کی کوشش کی گئی وہیں لاتعداد ایسی بھی نظمیں کہی گئیں جن میں آزادی وطن کے لیئے خوشی خوشی جام شہادت نوش کرنے والے شہیدان وطن کی قربانیوں کا ذکر کر کے اہل وطن میں سرفروشی کا جذبہ ابھارنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اردو شعراء نے اہل وطن کے سیاسی شعور کو جلا بخشنے کے لیئے جہاں مادر وطن کے مایہ ناز سپوتوں کی دائمی مفارقت پر مرثیے کہہ کر، ان کے عزم و حوصلے کی مدح سرائی کر کے ان کی خدمت میں گل ہائے عقیدت پیش کیئے وہیں انھوں نے آزادی کے حصول کے لیئے قید و بند کے مصائب کو برداشت کرنے والے اسیران اور دار و رسن کو گلے لگانے والے نامعلوم شہیدان وطن کو بھی خراج تحسین پیش کیا۔

اردو شاعری نے مادرِ ہند کی آزادی کے لیے
محکوم ہندوستانیوں کے قلوب میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی شمعیں
فروزاں کرنے کے لیے ان میں حب الوطنی کے جذبات کو بھڑکایا۔
دورِ محکومی میں ایسی بے شمار نظمیں منظرِ عام پر آئیں جن میں
اہلِ ملک کے وطن دوستی کے رجحان کو تیز سے تیز کرنے اور
انھیں نشہ حب وطن سے سرشار کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔
اردو شعراء نے سرزمین وطن سے والہانہ عقیدت و محبت کے
اظہار کے ساتھ اہلِ ہند کو اس کی عظمتوں اور رفعتوں کا احساس
بھی دلایا وطن کو غلامی کے تعرِ مذلت سے نکالنے کے لیے انھوں
نے خود بھی اپنا تن من دھن نثار کر دینے کا عزم کیا اور اہلِ ملک
کو بھی حوصلہ دلایا کہ وہ ملک کو آزاد کرانے کے لیے بڑی سے
بڑی قربانی دینے سے گریز نہ کریں۔ اس طرح اردو شاعری نے
ہر طریقے سے اپنے ہم وطنوں میں حب الوطنی کے شعور کو تقویت
پہنچائی اور اپنے وطن عزیز کو آزادی کی منزل تک پہنچانے میں
اس نے جو لائق تحسین کردار ادا کیا اس کی نظیر عالمی ادب کی
کسی اور زبان میں نہیں مل سکتی۔

کتابیات

۱ اردو میں قومی شاعری کے سو سال مرتبہ علی جواد زیدی
اتر پردیش اردو اکیڈمی ۱۹۸۲ء
۲۔ اردو شاعری میں قومی یکجہتی کے عناصر ڈاکٹر مجاور حسین رضوی
اتر پردیش اردو اکیڈمی ۱۹۸۵ء
۳۔ اردو شاعری میں قومی یکجہتی کی روایت ڈاکٹر رام آسرا راز
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اردو بازار
۴۔ اردو شاعری کا سماجی پس منظر ڈاکٹر اعجاز حسین
۵۔ دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی اور فکری پس منظر ڈاکٹر محمد حسن
۶۔ جدید اردو شاعری عبدالقادر سروری
۷۔ جدید اردو شاعری ڈاکٹر عبادت بریلوی
۸۔ تحریک آزادی میں اردو کا حصہ ڈاکٹر معین الدین عقیل
انجمن ترقی اردو پاکستان ۱۹۷۶ء
۹۔ ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں اردو شاعری کا حصہ
ڈاکٹر درخشاں تاجور لکھنو
۱۰۔ انگریزی عہد میں ہندوستانی تمدن کی تاریخ عبداللہ یوسف علی
۱۱۔ ہندوستانی مسلمان آئینہ ایام میں ڈاکٹر سید عابد حسین

۱۲ قومی تہذیب کا مسئلہ ڈاکٹر سید عابد حسین انجمن ترقی اردو (ہند)
علی گڑھ ۱۹۵۵ء
۱۳۔ عہد حاضر کے بڑے لوگ حصہ اول مرزا محمد دہلوی دہلی ۱۹۳۹ء
۱۴۔ علی گڑھ تحریک کے اساسی پہلو پروفیسر احتشام حسین
۱۵۔ ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر ترتیب پروفیسر قمر رئیس
عاشور کاظمی
۱۶۔ اردو ادب آزادی کے بعد ڈاکٹر اعجاز حسین
۱۷۔ آزادی کے بعد ہندوستان کا اردو ادب ڈاکٹر محمد ذاکر
۱۸۔ تنقیدی جائزے پروفیسر احتشام حسین
۱۹۔ زندگی اور ادب ڈاکٹر ظل حسنین
۲۰۔ قومی تعمیر کی دستاویز ڈاکٹر عبد الاحد
۲۱۔ بھارت کا راشٹریہ اندولن حصہ اول (ہندی) پروفیسر مکٹ
بہاری لال
۲۲۔ تنقید کیا ہے (بار پنجم) آل احمد سرور
۲۳۔ لکھنؤ کا دبستان شاعری ابو اللیث صدیقی
۲۴۔ دلی کا دبستان شاعری ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی

۲۵ تذکرہ شعرائے اردو مرتبہ ڈاکٹر اے وحید کراچی

۲۶۔ مقدمہ شعر و شاعری مولانا الطاف حسین حالی

۲۷۔ مقالات حالی حصہ اول مولانا الطاف حسین حالی دہلی ۱۹۳۴ء

۲۸۔ تحقیقی مطالعہ حالی ظہیر احمد صدیقی

۲۹۔ خطبات آزاد مولانا ابوالکلام آزاد مرتب مالک رام
ساہتیہ اکیڈمی ۱۹۸۵ء

۳۰۔ انوار اقبال مرتبہ بشیر احمد ڈار اقبال اکیڈمی کراچی

۳۱۔ مقامین اقبال علامہ اقبال

۳۲۔ نقوش اقبال مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

۳۳۔ آب حیات مولانا محمد حسین آزاد

۳۴۔ خسرو کا ذہنی سفر ڈاکٹر ظ انصاری

۳۵۔ درگا سہائے سرور جہان آبادی حیات و شاعری باوا کرشن گوپال مخلص
لکھنو ۱۹۸۲ء

۳۶۔ چکبست حیات اور ادبی خدمات ڈاکٹر اقبال احمد

۳۷۔ اکبر کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ ڈاکٹر صغریٰ مہدی

۳۸۔ مصحفی حیات و کلام افسر صدیقی امروہوی مکتبہ بنیاد کراچی

۳۹ شہر آشوب کا تحقیقی مطالعہ ڈاکٹر نعیم احمد مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
نئی دہلی ۱۹۶۸ء
۴۰۔ نفرتی ملک الشعرائے بیجاپور کے حالات و کلام پر تبصرہ مولفہ
مولوی عبدالحق انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی
۴۱۔ من لگن مصنفہ قاضی محمود بحری قدس سرہ مرتبہ محمد سخاوت مرزا
انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی ۱۹۵۵ء
۴۲۔ کلام سودا ڈاکٹر خورشید الاسلام انجمن ترقی اردو (ہند)
علی گڈھ ۱۹۶۲ء
۴۳۔ نظم آزاد مولانا محمد حسین آزاد لاہور
۴۴۔ مجموعہ نظم حالی ظہیر احمد صدیقی
۴۵۔ دیوان حالی الطاف حسین حالی ۱۸۹۳ء
۴۶۔ دیوان غالب جدید مرتبہ مفتی محمد انوار الحق ۱۹۸۲ء
۴۷۔ دیوان ناسخ حصہ دوم مطبع نول کشور لکھنو ۱۹۲۳ء
۴۸۔ کلیات محمد قلی قطب شاہ ڈاکٹر سیدہ جعفر ترقی اردو بیورو
۴۹۔ کلیات ولی مرتبہ جناب علی احسن، احسن مارہروی
انجمن ترقی اردو ۱۹۲۷ء

۵۰ کلیات آتش آتش کراچی ۱۹۶۳ء

۵۱- کلیات مصحفی بہ تصحیح نثار احمد فاروقی

۵۲- کلیات اکبر الہ آبادی اکبر الہ آبادی دہلی

۵۳- کلیات حسرت موہانی حسرت موہانی دہلی ۱۹۷۷ء

۵۴- کلیات شبلی شبلی

۵۵- کلیات منیر منیر شکوہ آبادی لکھنو

۵۶- کلیات فیض فیض احمد فیض

۵۷- کلیات اقبال علامہ اقبال

۵۸- انتخاب نظیر اکبر آبادی رشید حسن خاں

۵۹- انتخاب ناسخ تصحیح و ترتیب رشید حسن خاں مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی

۶۰- انتخاب کلام مخدوم انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڈھ ۱۹۵۳ء

۶۱- انتخاب کلیات جوش مرتب ڈاکٹر فضل امام

۶۲- بانگ درا علامہ اقبال مع شرح پروفیسر یوسف سلیم چشتی اعتماد پبلشنگ ہاؤس ۱۹۷۵ء

۶۳- بال جبریل علامہ اقبال

۶۴ تذکرہ سرور مرتبہ قاضی محمد غوث فضاء حیدرآبادی

۶۵۔ نوائے سرور ڈاکٹر حکم چند نیر

۶۶۔ صبح وطن چکبست لکھنوی

۶۷۔ شعلہ و شبنم جوش ملیح آبادی ہمالیہ بک ہاوس دہلی

۶۸۔ حرف و حکایت جوش ملیح آبادی

۶۹۔ کاروان وطن تلوک چند محروم مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی ۱۹۶۰ء

۷۰۔ گنج معانی تلوک چند محروم

۷۱۔ سخن جوہر مرتبہ اختر لبستوی اتر پردیش اردو اکیڈمی ۱۹۸۳ء

۷۲۔ بہارستان ظفر علی خاں ۱۹۳۷ء

۷۳۔ نگارستان ظفر علی خاں لاہور

۷۴۔ جوئے شیر آنند نرائن ملا لکھنو ۱۹۴۹ء

۷۵۔ میری حدیث عمر گریزاں آنند نرائن ملا

۷۶۔ زندان حماقت احمق پھپھوندوی

۷۷۔ ساز و آہنگ سیماب اکبرآبادی آگرہ ۱۹۴۱ء

۷۸۔ کارامروز سیماب اکبرآبادی

۷۹۔ واردات پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی ۱۹۴۱ء

۸۰ بیام دوح حامد اللہ افسر

۸۱۔ بادہ مشرق حصہ اول ساغر نظامی

۸۲۔ افکار سلیم مرتبہ شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی حالی اکیڈمی ۱۹۳۸ء

۸۳۔ روشن اندھیرا شمیم کرہانی ۱۹۴۶ء

۸۴۔ آتش گل جگر مرادآبادی

۸۵۔ غم دوراں مرتبہ غلام ربانی تاباں

۸۶۔ تلخیاں ساحر لدھیانوی

۸۷۔ نقش فریادی فیض احمد فیض

۸۸۔ ماورا ن۔م۔ راشد مکتبہ اردو لاہور ۱۹۴۱ء

۸۹۔ دیار سحر علی جواد زیدی دہلی ۱۹۶۵ء

۹۰۔ سرخ سویرا مخدوم محی الدین حیدرآباد ۱۹۴۴ء

۹۱۔ آہنگ مجاز آزاد کتاب گھر دہلی

۹۲۔ روح کائنات فراق گورکھپوری

۹۳۔ اجنبی شہر اجنبی راستے راہی معصوم رضا

۹۴۔ نئی دنیا کو سلام اور جمہور علی سردار جعفری مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
نئی دہلی ۱۹۷۲ء

۹۵ خون کی لکیر علی سردار جعفری

۹۶۔ آخر شب کیفی اعظمی کتب پبلشرز لمیٹڈ بمبئی ۱۹۴۷ء

۹۷۔ جھنکار کیفی اعظمی

۹۸۔ پھولوں کے گیت اختر شیرانی

۹۹۔ لالہ طور اختر شیرانی

۱۰۰۔ نقش جمیل جمیل مظہری ۱۹۵۳ء

۱۰۱۔ نوائے ظفر مرتبہ خلیل الرحمٰن اعظمی انجمن ترقی اردو (ہند) دلی ۱۹۷۵ء

۱۰۲۔ خمخانۂ دہلی مرتبہ تفضل حسین کوکب لاہور ۱۹۵۴ء

۱۰۳۔ ضبط شدہ نظمیں مرتبین خلیق انجم، مجتبیٰ حسین نئی دلی ۱۹۷۵ء

۱۰۴۔ مشاعرہ زندان مطبوعہ اتر پردیش اردو اکیڈمی لکھنو ۱۹۸۲ء

۱۰۵۔ پیکر نغمہ نعیم حامد علی جدہ ۱۹۸۶ء

۱۰۶۔ ہندوستان ہمارا جلد اول مرتبہ جاں نثار اختر بمبئی ۱۹۷۴ء

۱۰۷۔ ہندوستان ہمارا جلد دوم مرتبہ جاں نثار اختر۔ بمبئی ۱۹۷۴ء

۱۰۸۔ روزنامہ جنگ کراچی یکم جولائی ۱۹۵۷ء

۱۰۹۔ علی گڈھ میگزین شمارہ خصوصی علی گڈھ نمبر ۵۴-۱۹۵۳ء

۱۱۰۔ ماہنامہ معارف اعظم گڈھ مئی ۱۹۸۵ء

۱۱۱۔ نقوش لاہور ستمبر ۱۹۴۷ء

۱۱۲۔ شاعر قومی یکجہتی نمبر

۱۱۳۔ ماہنامہ نگار لکھنو جون ۱۹۴۱ء

۱۱۴۔ New Light's English-English-Hindi Dictionary Edited by Anjay Kumar & A.K. Mitra III A.D 1979

۱۱۵۔ The New Oxford ILLustrated Dictionary

Oxford Incyclopedia Dictionary. FLOPiP$_2$

۱۱۶۔ Webster Universal Dictionary WYLD

۱۱۷۔ Oxford Arabic-English Dictionary of Current Usage

۱۱۸۔ Dictionary of Political Thought: Roger Scruton, Pan Books London 1982

۱۱۹۔ Dr. Tara Chand: History of Freedom movement Vol II

Dr. S. Moinul Haq: A History of Freedom -۱۲۰
movement Vol III (1906-1936) Part I
Prepared by the Board of Editors Pakistan
Historical Society Karachi pakistan 1961
Chapter VI

R.C. Majamdar: Struggle for Freedom -۱۲۱
Vol XI

Jawaharlal Nehru: Glimpses of -۱۲۲
World History

B. G. Gokhale: Making of the Indian -۱۲۳
Nation

Mac Iver: A Text Book of Sociology -۱۲۴

J. S. Mill: Consideration of Representa -۱۲۵
tive Government

Karl Marx & Fredrick Engles: Selected -۱۲۶
Works Vol I

DECLARATION

This is to certify that I, MOHD. SHUJATH ALI have carried out the research embodies in this thesis entitled "URDU SHAIRI MAIN HUBBULWATNI" (1857-1947) (Patriotism in Urdu Poetry, 1857-1947) for the full period prescribed under the Ph.D. Ordinances of the University.

I declare to the best of my knowledge that no part of this thesis was earlier submitted for the award of any research degree or diploma to this or any other University.

STATION: HYDERABAD

DATE : 2/5/94

MOHD. SHUJATH ALI
DEPARTMENT OF URDU
UNIVERSITY OF HYDERABAD
HYDERABAD - 500 134

DR. RAHMATH YOUSUF ZAI
Reader, Urdu Department
University of Hyderabad

C E R T I F I C A T E

This is to certify that the thesis entitled "**URDU SHAIRI MAIN HUBBULWATNI** (1857-1947), Patriotism in Urdu Poetry (1857-1947) submitted by **MOHD SHUJATH ALI** for the degree of Doctor of Philosophy to the department of Urdu, School of Humanities, University of Hyderabad has been carried out under my supervision and embodies the result of bonafide research work.

I certify further that such help or source of information as had been availed of by the researcher in the course of the work has been duly acknowledged.

I recommend that the thesis be sent to the examiner for evaluation.

STATION: HYDERABAD
DATE : 2/5/94

DR. RAHMATH YOUSUF ZAI
(SUPERVISOR)

2/5/94

HEAD DEPARTMENT OF URDU

DEAN SCHOOL OF HUMANITIES

DEAN
SCHOOL OF HUMANITIES,
University of Hyderabad,
Hyderabad-500 134.

PATRIOTISM IN URDU POETRY
(1857-1947)

THESIS FOR Ph.D. (URDU)

Submitted By

MOHD. SHUJATH ALI

Supervised By

DR. RAHMATH YOUSUF ZAI

READER DEPARTMENT OF URDU



DEPARTMENT OF URDU

School of Humanities

UNIVERSITY OF HYDERABAD

HYDERABAD 500 134.

1994